رمضان اور جدید مسائل

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

رمضان اور جدید مسائل

اضافہ شدہ جدید ایڈیشن

تالیف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

تعلیق

مولانا یاسین قاسمی

استاذ الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم /بنگلور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نام کتاب : **رمضان اور جدید مسائل**

تالیف : **حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی** دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم بنگلور
وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مرتب : مولانا یاسین صاحب

صفحات : ۲۴۳

تاریخ طباعت : صفر المظفر ۱۴۳۷ھ

ناشر : **مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور**

موبائل نمبر : 9634307336 9036701512

ای میل : **maktabahmaseehulummat@gmail.com**

فہرست مضامین

رؤیتِ ہلال

روزہ

اعتکاف

تراویح

صدقۂ فطر وفدیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

التقریظ

فقیہ العصر، قاضی القضاۃ، حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی رحمہ اللہ

''مولانا شعیب اللہ مفتاحی بنگلوری''، اس وقت ملک کے ممتاز علما اور جید الاستعداد فضلا میں سے ہیں، جنہیں اللہ نے فہمِ دین اور تفقہ؛ نیز ذوقِ تحقیق کی دولت عطا فرمائی ہے، ''**مجمع الفقه الإسلامي**'' کے مذاکرات میں، ہم ان کے مقالات و بحوث سے مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ ابھی مولانا موصوف کی تصنیف ''رمضان اور جدید مسائل'' نظر سے گذری، اکثر و بیشتر جدید مسائل، جن سے آج روزہ دار دوچار ہوتے ہیں، ان سب پر موصوف نے بحث کی ہے اور مشکلات کا حل نکالا ہے، فجزاهم الله خير الجزاء۔

علمی مسائل اور اجتہادی آرا میں اختلافِ نظر و فکر ضروری ہے؛ لیکن اپنی رائے پر اصرار اور ضد نہ ہو، حق کی تلاش ہو، تو یہ حسن ہے؛ مجھے خوشی ہے کہ مولانا موصوف نے جدید مسائل کے صحیح حل کے لیے صحیح راہ اختیار کی۔

میں توفیقِ مزید کی دعا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کتاب سے مسلمانوں کو اور اہلِ علم کو فائدہ پہنچے گا، إن شاء الله۔

فقط

(حضرت اقدس مولانا) مجاہد الاسلام قاسمی (رحمہ اللہ)

نزیل، دار العلوم سبیل الرشاد، بنگلور

بہ تاریخ: ۵/ مارچ ۱۹۹۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

التقریظ

شیخ الحدیث حضرت علامہ رفیق احمد صاحب رحمہ اللہ

خلیفہ حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ

رسالہ ''رمضان اور جدید مسائل'' مؤلفہ عزیزم مولانا محمد شعیب اللہ صاحب مفتاحی، بنگلوری، مہتمم ''مدرسہ مسیح العلوم، بنگلور'' کا مسودہ دیکھا، تفصیل سے مطالعے کا موقعہ تو نہ ملا؛ البتہ چیدہ چیدہ مقامات نظر سے گزرے، رسالہ بہت خوب ہے اور عالم نوجوان نے بڑی سلیقہ مندی اور تخلیق وکاوش سے کام لیا ہے، امید کرتا ہوں کہ نافع اور مفید ہوگا، دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو قدردانی اور حوصلہ افزائی کا جذبہ عطا فرمائیں۔

رسالے کا امتیاز یہ ہے کہ جدید مسائل پر عمدہ تحقیقات پیش کی گئی ہیں اور نظرِ غائر سے مطالعہ کیا جائے، تو سکونِ قلب اور اطمینانِ شرعی حاصل ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو مفید اور نافع فرمائیں۔

فقط

(حضرت علامہ) رفیق احمد (صاحب)

واردِ حال، بنگلور

بہ تاریخ: ۷/ شعبان المعظم ۱۴۰۹ھ

مطابق ۱۶/ مارچ ۱۹۸۹ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

التقریظ

حضرت مولانا مفتی مہربان علی صاحب رحمہ اللہ

استاذ مدرسہ امداد الاسلام، ہرسولی (یوپی)

زیرِ نظر کتاب ''رمضان اور جدید مسائل'' اپنے موضوع پر مفید، مؤثر اور تحقیقی کتاب ہے، بندہ نے اس کا مسودہ اضافے کے بعد دیکھا ہے، محترم ''مولانا شعیب اللہ صاحب'' کے دینی اور تحقیقی دیگر رسائل و کتب کی طرح ان شاء اللہ یہ کتاب بھی پسندیدہ نگاہوں سے دیکھی اور پڑھی جائے گی، اللہ تعالیٰ شرور و فتن سے حفاظت فرمائے اور موصوف کو علمی، عملی، تقریری، ظاہری، باطنی؛ ہر نوع کی ترقیات سے نوازتا رہے، صدق و صفا کی دولت سے اللہ تعالیٰ ہر صاحبِ ایمان کو حصہ عطا فرمائے، کفر کی ظلمات ختم ہوں، ایمانی اور اسلامی شعاؤں سے پورا عالم منور ہو جائے۔

فقط

(حضرت مولانا) مہربان علی بڑوتوی (رحمہ اللہ)

بہ تاریخ: ۸/ ربیع الثانی ۱۴۱۸ھ، چہار شنبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

التقریظ

حضرت مولانا عبدالرحیم صاحب بستوی رحمہ اللہ

(سابق استاذ دارالعلوم دیوبند)

حامداً و مصلیاً:

عزیزم، مکرم ''جناب مولانا مفتی محمد شعیب اللہ صاحب مفتاحی'' مدفیضہ، مہتمم مدرسہ ''مسیح العلوم''، بنگلور ایک جید الاستعداد عالم ہیں، تالیف اور تصنیف کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، اخبارات اور جرائد میں ان کے مفید اور تحقیقی مضامین برابر چھپتے ہیں اور متعدد کتابیں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آچکی ہیں اور لوگ ان سے بھرپور استفادہ کر رہے ہیں، ''کلمۂ حق'' مولانا موصوف کا امتیازی وصف ہے، ''رمضان اور جدید مسائل'' مولانا کی ایک وقیع اور معلومات افزا تصنیف ہے، اس میں بہت ہی اہم اور ضروری مسائل جمع کر دیے ہیں، یہ کتاب ہر گھر میں رہنے کے قابل ہے، اللہ تعالیٰ اس کو قبولِ تام عطا فرمائے، (آمین)۔

(حضرت مولانا) عبدالرحیم بستوی (رحمہ اللہ)

خادمِ تدریس، دارالعلوم دیوبند (یوپی)

بہ تاریخ: ١٢/ رمضان المبارک ١٤١٨ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

التقریظ

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہٗ

صدر مدرس دار العلوم سبیل السلام، حیدر آباد

شریعتِ اسلامی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی جامعیت اور ابدیت ہے، زندگی کا کوئی شعبہ نہیں کہ اسلام نے اس کو اپنے نورِ ہدایت سے محروم رکھا ہو، عبادات ہو یا معاملات، شخصی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، اسلام نے کہیں بھی انسانیت کو اندھیرے میں نہیں رکھا، اسی طرح اسلام ایک عہد اور ایک دَور کا مذہب نہیں؛ بل کہ وہ قیامت تک انسان کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتا رہے گا، اس نے انسانی زندگی کے لیے ایسے اصول وقواعد مقرر کر دیے ہیں کہ ہر عہد میں اس کی تطبیق کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔

پھر ہمارے فقہائے کرام نے ذہانت وبالغ نظری اور فکر رَسا کے ذریعے قرآن وحدیث سے اخذ واستنباط اور فکر واجتہاد کا جو عظیم سرمایہ ہدایت کے لیے چھوڑا ہے، وہ خود بھی خضرِ طریق کا درجہ رکھتا ہے اور کم ایسے مسائل ہوں گے کہ جن کی عقدہ کشائی اس عظیم علمی سرمایے سے نہ ہو پاتی ہو؛ اس لیے علما کا فریضۂ منصبی ہے کہ وہ ہر عہد کے نئے پیدا شدہ مسائل کو حل کریں اور ہر زمانے میں علما وارباب ِافتا اس فریضے سے عہدہ برآ ہوتے رہے ہیں۔ عصرِ حاضر نے جو نئے مسائل پیدا کیے ہیں، ان میں بہت سے مسائل وہ ہیں، جو روزہ ورمضان سے متعلق ہیں، یوں تو اس

موضوع پر فتاویٰ اور احکام کے ذیل میں مختلف اہلِ علم نے قلم اٹھایا ہے؛ لیکن ان مسائل کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ کوئی صاحبِ علم مستقل طور پر اس موضوع پر قلم اٹھائے اور اس کو اپنی بحث اور گفتگو کا موضوع بنائے ۔ محبی ''مولانا محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی'' (مہتمم مدرسہ مسیح العلوم، بنگلور) کو اللہ جزائے خیر دے کہ انہوں نے یہ قیمتی تحریر خاص اس موضوع پر مرتب کی ہے، جس میں رؤیتِ ہلال، طویل الاوقات علاقوں میں روزہ، نماز اور روزے کی نسبت سے اس عہد میں پیدا ہونے والے مسائل پر بصیرت مندانہ گفتگو کی گئی ہے۔

یوں تو خصوصیت سے نئے مسائل میں اختلافِ رائے کی گنجائش رہتی ہے اور ممکن ہے کہ بعض اہلِ علم کو بعض مسائل میں ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف ہو؛ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے اخلاص اور محنت کے ساتھ ان احکام پر بحث کرنے اور نتائج اخذ کرنے کی سعی کی ہے اور ہر جگہ سلَفِ صالحین کے نقشِ قدم کو اپنے لیے نقشِ پیروی بنایا ہے۔

فجزاہ اللّٰہ خیرَ الجزاء، وبارك اللّٰہ في علمہٖ ونفع بہ المسلمین ۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو قبولِ عام و تام اور مؤلف گرامی کو مزید علمی کاموں کی توفیق عطا فرمائے اور علم و قلم کا یہ مسافر ہمیشہ تعب و تھکن سے نا آشنا رہے، وباللّٰہ التوفیق وھو المستعان۔

(حضرت مولانا) خالد سیف اللہ رحمانی (مدظلہٗ العالی)

خادمِ حدیث وفقہ دار العلوم سبیل السلام، حیدرآباد

نقشِ اولین

نحمدہٗ ونصلي علی رسوله الکریم، أما بعد:

دورِ حاضر کے جدید اکتشافات وتحقیقات، نئے نئے آلات وایجادات اور حیرت افزا حالات وواقعات نے جو بے شمار مسائل پیدا کر دیے ہیں، ان میں سے بہت سے مسائل وہ ہیں، جن کا تعلق دین کے ایک اہم شعبے یعنی ''فقہ'' سے ہے، ان مسائل نے علمائے اسلام کو ان کے حل کرنے کی دعوت دے دی ہے۔

یہ علم وتحقیق کی ترقی وتطور یا اگر ایک طرف انسانیت کے لیے ایک تحفۂ نادرہ اور نعمتِ غیر مترقبہ ہے، تو دوسری طرف دینِ اسلام کی حقانیت وصداقت، اس کی علمیت ومعقولیت کو آشکارا کرنے کی ایک خدائی تدبیر ہے؛ کیوں کہ جوں جوں ایسے مسائل سامنے آکر اسلامی نقطۂ نظر سے حل ہوتے جائیں گے، اسلام کی صداقت وحقانیت کا پرچم اتنی ہی جرأت کے ساتھ بلند کیا اور لہرایا جا سکے گا اور اس کی علمیت ومعقولیت اسی قدر صفائی سے آشکارا ہوگی۔

لہٰذا نئے نئے مسائل کے شرعی وفقہی حل کی طرف توجہ دینا، ایک اہم ترین اسلامی فریضہ ہے اور دینی ضرورت ہے؛ چناں چہ ہر زمانے کے علما نے نہ صرف یہ کہ اس کام کی اہمیت اور ذمہ داری محسوس کی؛ بل کہ اس کو روبہ عمل لانے کی بھی بھرپور کوشش فرمائی اور ان جدید مسائل پر اسلامی نقطۂ نظر سے غور وفکر کر کے ان کا شرعی وفقہی حل پیش کیا۔ الحمد للہ اب تک جدید مسائل پر بہت بڑا ذخیرہ فقہی وشرعی نقطۂ نظر سے تیار ہو چکا ہے۔

زیرِ نظر رسالہ بھی اسی سلسلے کی ایک حقیر کڑی ہے، جس میں صرف ان مسائل

کوزیرِ بحث لایا گیا ہے، جن کا تعلق رمضان المبارک سے ہے؛ مثلاً: رؤیتِ ہلال، روزہ، تراویح، اعتکاف، صدقۂ فطر وفدیہ؛ ان ابواب سے متعلق جدید مسائل سے اس میں بحث کی گئی ہے۔

یہ رسالہ پہلی دفعہ ۱۴۰۹ھ مطابق ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا، اب دوبارہ نظرِ ثانی کے بعد اور متعدد مقامات کی توضیح اور متعدد مسائل کے اضافے کے ساتھ شائع ہو رہا ہے، اس رسالے میں میں نے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ

(۱) ہر مسئلے میں قدیم فقہا کے کلام سے کوئی صریح جزئیہ مل جائے یا اس مسئلے کی نظیر مل جائے۔

(۲) دوسرے نمبر پر اکابر علما، جیسے حضرت تھانوی، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب، مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمہم اللہ وغیرہ حضرات کی علمی وفقہی تحقیقات سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے۔

(۳) جہاں کوئی واضح کلام ان حضرات کا نہ مل سکا، وہاں مستند فقہی نظائر سے مسئلے کا استنباط کیا گیا ہے اور حتی الامکان احتیاط کے پہلو کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

(۴) بعض بعض مسائل میں معاصر علما کی آرا سے اختلاف بھی کیا ہے اور اس کے دلائل بھی وضاحت سے پیش کر دیے گئے ہیں؛ مگر چوں کہ یہ اجتہادی مسائل ہیں ؛ اس لیے کسی کو دوسری رائے صحیح معلوم ہو، تو وہ بلاشبہ اپنی رائے پر عمل کر سکتا ہے اور اگر میری رائے کی غلطی واضح ہو جائے، تو بندے کو اپنی رائے پر اصرار بھی نہ ہو گا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس رسالے کو مفید ومقبول بنائے اور میرے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے، آمین۔

فقط

محمد شعیب اللہ عفی عنہ

تاریخ: ۵/ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ طبعۂ خامسہ

رسالہ ''رمضان اور جدید مسائل'' کی یہ پانچویں اشاعت ہے، اس اشاعت میں بعض مسائلِ جدیدہ کا اضافہ کیا گیا ہے، جو وقتاً فوقتاً سامنے آتے رہے؛ نیز بعض مسائل کے بارے میں پہلی رائے سے رجوع کرتے ہوئے، دوسری رائے اختیار کی گئی ہے۔

مولانا ''یاسین صاحب'' استاذ جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور نے اس کے فقہی نصوص کو ازسرنو دیکھ کر تصحیح بھی کی ہے اور مزید حوالجات سے مزین بھی کیا ہے؛ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

۱۲/ ربیع الاول ۱۴۳۷ھ

مطابق ۲۴/ ڈسمبر ۲۰۱۵ء

رؤیتِ ہلال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رؤیتِ ہلال

اسلام میں رمضان المبارک کی ابتدا و انتہا کو چوں کہ رؤیتِ ہلال پر موقوف رکھا گیا ہے، اس لیے سب سے پہلے اسی کے متعلق مسائل کو زیرِ بحث لایا جاتا ہے، رؤیتِ ہلال کے جن مسائل کو یہاں زیرِ بحث لایا جائے گا، وہ دو قسم کے ہوں گے: ایک وہ جو نئے حالات کی وجہ سے رونما ہوئے ہیں، دوسرے وہ، جن کو نئے آلات نے جنم دیا ہے۔

عید و رمضان کی وحدت کا اہتمام

ذرائعِ ابلاغ کی فراوانی اور خبر رسانی کی سہولت و آسانی نے، عام لوگوں میں عموماً اور جدید تعلیم یافتہ طبقے میں خصوصاً اس بات کا رجحان پیدا کر دیا ہے کہ ساری دنیا میں عید و رمضان کے ایام میں وحدت ہو، کہ ایک ہی دن سب جگہ عید ہو اور رمضان کی ابتدا اور انتہا میں بھی ہر جگہ توافق ہو اور اگر ساری دنیا میں نہیں تو کم از کم ایک ملک کے تمام علاقوں اور شہروں میں یہ وحدت پائی جائے۔

اس خیال کے حامی لوگوں کا خیال ہے کہ موجودہ دَور میں خبر رسانی کی جو سہولتیں جدید آلات کی متنوع قسموں نے پیدا کر دی ہیں، ان کے پیشِ نظر آج اس وحدت کا اہتمام کچھ مشکل نہیں؛ کیوں کہ ایک ملک کے ایک کونے کی خبر دوسرے کونے میں؛ بل کہ دنیا کے ایک کونے کی خبر دوسرے کونے میں بہت جلد اور بہ آسانی پہنچائی جاسکتی ہے۔

یہ خیال بہ جائے خود صحیح ہے اور خود اسلام میں بھی ایک گونہ وحدت واتحاد مطلوب ہے؛ البتہ اس سلسلے میں دو باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے:

ایک تو یہ کہ کیا پوری دنیا میں ایک ہی دن عید و رمضان ہونے کا مسئلہ ممکن العمل بھی ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں؛ کیوں کہ مشرق و مغرب کے مابین فاصلوں کی وجہ سے ایک جگہ جمعہ ہوتا ہے، تو دوسری جگہ ابھی جمعرات کا دن ہوتا ہے اور تیسری جگہ ہفتے کا دن شروع ہو چکا ہوتا ہے؛ ان حالات میں یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہر جگہ رمضان وعید میں وحدت ہو؟ اس لیے بس اس حد تک وحدت کا اہتمام کیا جانا چاہیے، جہاں تک کہ وحدت کا امکان ہو، اس سے زیادہ کاوش فضول اور بے کار ہے۔

دوسری بات یہ کہ اسلام میں عید و رمضان کے ایک ہی دن ہونے کی کچھ خاص اہمیت نہیں ہے کہ اسی کے پیچھے اپنی تمام کوششیں لگا دی جائیں؛ اگر وحدت میسر آجائے تو ٹھیک؛ ورنہ اس میں رتی برابر کوئی قباحت نہیں کہ متعدد جگہوں پر متعدد ایام میں عید و رمضان ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اگرچہ آج کل کی طرح خبر رسانی کی اتنی سہولتیں نہ تھیں اور اس وجہ سے پورے ملک کی خبروں کو جمع کرنا اور معلوم کرنا آسان نہ تھا، بل کہ ممکن بھی نہ تھا؛ مگر اس میں کیا شک ہے کہ مدینے کی قریبی آبادیوں و بستیوں سے چاند کی خبر معلوم کرنا چنداں مشکل کام نہ تھا؛ لیکن اس کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کبھی اس کا اہتمام نہیں فرمایا؛ کیا یہ اس بات کی کھلی دلیل نہیں کہ اس کا اہتمام کچھ ضروری نہیں اور نہ خاص اہمیت کا حامل ہے؟

حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانے کا یہ واقعہ امام مسلم رحمہ اللہ نے صحیح میں درج کیا ہے کہ حضرت کریب رضی اللہ عنہ کو حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا نے اپنے کسی کام سے شام روانہ

کیا، وہاں حضرت کریب رضی اللہ عنہ نے رمضان کا چاند جمعہ کے دن دیکھا اور لوگوں نے حضرت امیرِ معاویہ رضی اللہ عنہ کے فیصلے سے روزہ بھی رکھا، پھر رمضان کے آخر میں حضرت کریب رضی اللہ عنہ مدینہ واپس آئے، تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے ان سے چاند کے بارے میں پوچھا؛ انہوں نے عرض کیا کہ جمعہ کی شب میں دیکھا گیا، ابن عباس رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ آپ نے بھی دیکھا تھا؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں میں نے بھی دیکھا اور دوسرے لوگوں نے بھی دیکھا اور روزہ رکھا اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے بھی روزہ رکھا، اس پر ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم نے تو ہفتے کی رات چاند دیکھا ہے؛ اس لیے ہم تو برابر روزہ رکھیں گے، جب تک کہ تیس دن پورے نہ ہو جائیں یا ہم چاند دیکھ لیں، حضرت کریب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا آپ کے لیے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا چاند دیکھنا اور ان کا روزہ رکھنا کافی نہیں ہے؟ فرمایا کہ نہیں ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔(۱)

---

(۱) عن كريب رضي الله عنه أن أم الفضل بنت الحارث رضي الله عنها بعثته إلىٰ معاوية بالشام رضي الله عنه . قال: فقدمتُ الشام ، فقضيت حاجتها ، واستهل عليَّ رمضان وأنا بالشام ، فرأيت الهلال ليلة الجمعة ، ثم قدمتُ المدينة في آخر الشهر ، فسألني عبد الله بن عباس رضي الله عنه ، ثم ذكر الهلال ، فقال: متىٰ رأيتم الهلال ؟ فقلت : رأيناه ليلة الجمعة ، فقال : أنت رأيته ؟ فقلت : نعم ! ورآه الناس ، وصاموا وصام معاوية رضي الله عنه ، فقال: لكنا رأيناه ليلة السبت فلا نزال نصوم حتىٰ نكمل ثلاثين أو نراه ، فقلت : أَ وَلا تكتفي برؤية معاوية و صيامهٗ ؟ فقال: لا! هٰكذا أمرنا رسول الله صلى الله عليه وسلم .“

(المسلم:۵۴۸، الرقم:۱۰۸۷، الترمذي:۲/۱۷، الرقم:۶۹۳، قال الترمذي : حديث ابن عباس حديث حسن ، صحيح، غريب، أبو داود:۲۶۶، الرقم: ۲۳۳۲، السنن الكبرى للنسائي:۳/۹۷، الرقم:۲۴۳۲)

اس واقعے میں اگر چہ فقہی نقطۂ نظر سے کئی احتمالات ہیں کہ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے شام کی رؤیت کو اس لیے تسلیم نہ کیا ہو کہ مدینہ اور شام کے مطلع میں فرق ہے یا اس لیے کہ شہادت دینے والے تنہا حضرت کریب رضی اللہ عنہ تھے اور ایک آدمی کی گواہی عید کے چاند میں معتبر نہیں ہوتی؛ مگر اس سے اتنا ضرور معلوم و ثابت ہوتا ہے کہ حضراتِ صحابہ کے عہد میں عید کی وحدت کا اہتمام نہیں تھا؛ حال آں کہ اہلِ مدینہ کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ شام سے خبر یا شہادت حاصل کرتے؛ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں اس کی خاص اہمیت نہیں ہے۔

بعض حضرات یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ اس زمانے میں مختلف جگہوں کی خبروں کو معلوم کرنا ممکن نہ تھا اور اس کے لیے وسائل اور ذرائع موجود نہ تھے؛ اس لیے انھوں نے اس کا اہتمام نہ کیا، اس کا جواب حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

> ''اس عہدِ مبارک میں اگر ہوائی جہاز، ریڈیو اور ٹیلیفون نہ تھے، تو تیز رفتار سانڈنیاں موجود تھیں، جو ایک رات دن میں دور تک کی خبریں؛ بل کہ شہادتیں لاسکتی تھیں؛ مگر حکیم الحکما صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی پسند نہ کیا کہ سانڈنی سوار دوڑا کر مکے سے مدینہ یا رابغ کی خبریں بہم پہنچائیں، شام اور مصر فتح ہونے کے بعد کوئی مشکل نہ تھی کہ وہاں کی شہادتیں ہر وقت سانڈنی سواروں کے ذریعے مدینہ طیبہ میں جمع کرلی جائیں؛ مگر کہیں نظر سے نہیں گزرا کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کا اہتمام فرمایا ہو۔'' (۱)

حاصل یہ کہ رمضان و عید کی وحدت و یکسانیت کے لیے زیادہ کاوش کرنے کی

---

(۱) آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام: ۱۷۴

کوئی ضرورت نہیں اور نہ یہ اس قدر اہتمام کی چیز ہے؛ ہاں! غلو میں پڑے بغیر اس کا اس حد تک اہتمام کر لینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ موجودہ وسائل شرعی حدود میں رہتے ہوئے اس کا ساتھ دے سکیں۔

دوسرے شہروں سے چاند کی خبر معلوم کرنا

اگر چاند نظر نہ آئے، تو دوسرے شہروں سے چاند کی خبر معلوم کرنا کیا درجہ رکھتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ واجب اور ضروری نہیں ہے ؛ کیوں کہ اللہ کے رسول ﷺ اور حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے دوسری بستیوں اور آبادیوں سے چاند کی خبر منگوانے اور معلوم کرنے کا کوئی اہتمام نہیں فرمایا؛ حال آں کہ اس زمانے میں -جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا- ان کے مناسبِ حال ذرائع ووسائل موجود تھے، یہ اس کی واضح دلیل ہے کہ دوسرے علاقوں اور شہروں سے چاند کی خبر معلوم کرنا ضروری وواجب نہیں ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ :صوموا لرؤيته وأفطروا لرؤيته ، فإن غُبِّيَ عليكم فأكملوا عدة شعبان ثلاثين.[1]»

ترجمہ : چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند دیکھ کر روزہ افطار کرو، پس اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے، تو تیس دن پورے کرو۔

اس حدیث میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ دوسری جگہوں سے چاند کی خبر حاصل کرنا ضروری نہیں ؛ کیوں کہ اس میں چاند کے پوشیدہ ومستور رہ جانے کی

---

(۱) البخاری:۳/۲۵۳،الرقم:۱۹۰۹،واللفظ له، المسلم:۶/۵۴۶،الرقم:۱۰۸۱ ، السنن الکبری للنسائی:۳/۱۰۰،الرقم:۲۴۳۹،الدارمی:۱۰۴۹،الرقم:۱۷۲۷

صورت میں ہمیں تیس دن پورے کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ اس صورت میں دوسری جگہوں سے تحقیق کرو؛ اگر یہ شرعاً واجب ہوتا، تو ضرور اس کا حکم دیا جاتا۔

حکیم الامت فقیہ الملت مجدد اعظم مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اسی سلسلے کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

''چوں کہ کوئی حکم بلا دلیل ثابت نہیں ہوتا اور اس کے (یعنی دوسری جگہ سے چاند کی خبر معلوم کرنے کے لیے) وجوب کی کوئی دلیل نہیں؛ لہٰذا یہ امر واجب نہیں''۔(۱)

راقم کہتا ہے کہ یہاں صرف یہ نہیں کہ دلیل ہی نہیں ہے؛ بل کہ — اوپر کی وضاحت کے مطابق — واجب نہ ہونے پر دلیل قائم ہے؛ لہٰذا یہ واجب نہیں ہے؛ البتہ یہ جائز ضرور ہے؛ کیوں کہ ناجائز ہونے پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے؛ لہٰذا حدود میں رہتے ہوئے اس کی اجازت ہے۔

تحقیقِ رؤیت کے لیے آلاتِ جدیدہ کا استعمال

رؤیتِ ہلال کی تحقیق کے لیے آلاتِ جدیدہ جیسے ریڈیو (Radio) ٹیلی ویژن (Television) وائرلس (Wireless) اور ٹیلی فون (Telephone) وغیرہ کا استعمال کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتیں ہیں، جو اللہ نے بندوں کے نفع کے لیے پیدا فرمائی ہیں، ان سے کام لینا اور فائدہ اٹھانا برا نہیں؛ بل کہ جذباتِ شکر کے ساتھ ان سے انتفاع کرنا پسندیدہ بات ہے؛ لیکن یہ لحاظ رہے کہ خدا کی ان نعمتوں کو خدا کی مخالفت و نافرمانی، معصیت

---

(۱) امداد الفتاوی: ۲/۹۹

اور ناشکری میں استعمال نہ کیا جائے ؛لہٰذا تحقیقِ رؤیتِ ہلال کے لیے بھی آلاتِ جدیدہ سے ضرور فائدہ اٹھایا جائے ؛ مگر کسی شرعی ضابطے اور اصول کو توڑا نہ جائے ؛ مثلاً : رؤیتِ ہلال کی تحقیق میں ان آلات و وسائل سے حاصل ہونے والی وہ خبر تو قابلِ قبول ہوسکتی ہے، جو رمضان کے چاند کے بارے میں ہو اور جو خبر عید کے بارے میں ہو، وہ معتبر نہ ہوگی : کیوں کہ اس کے لیے شہادت ''گواہی'' ضروری ہے اور ان آلات کی خبر ''خبر'' تو ہے، ''شہادت'' نہیں ہے۔(۱)

لہٰذا اس پر اصرار کرنا کہ اس خبر کو یہاں بھی قبول کیا جائے ، یہ شرعی اصول کے خلاف ہونے کی وجہ سے خدا کی نافرمانی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ ان آلات کو کام میں لانا اور ان سے فائدہ اٹھانا، اس وقت تک جائز ہے، جب تک کہ شرعی و اسلامی اصول مجروح نہ ہوں۔

مگر یاد رہے کہ ان آلات کے ذریعے رؤیت کی تحقیق کرنا شرعاً واجب وضروری نہیں ہے ؛اس لیے کہ اس کے واجب ہونے کی کوئی دلیل نہیں ؛ بل کہ اوپر معلوم ہو چکا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے زمانے کے وسائل و ذرائع سے بھی تحقیقِ رؤیت کا اہتمام نہیں فرمایا؛ حال آں کہ اس وقت یہ ممکن تھا کہ '' سانڈنی سواروں'' کو دوڑا کر مدینہ کے قریب کی بستیوں اور آبادیوں سے رؤیت کی تحقیق کی جائے۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کے وسائل کو رؤیت کی تحقیق کے لیے استعمال میں لانا شرعاً ضروری نہیں ہے؛ صرف یہ جائز ہے جب کہ حدودِ شرعیہ سے تجاوز نہ کیا جائے۔

---

(۱) ان مسائل کی تحقیق و تفصیل آگے آرہی ہے

رؤیتِ ہلال اور آلاتِ جدیدہ

دورِ حاضر میں آلاتِ جدیدہ کی بھرمار ہے، انہیں میں وہ آلات بھی ہیں جو دُور کی چیزوں کو قریب اور چھوٹی چیزوں کو بڑی بنا کر پیش کرتے ہیں؛ نیز فضا میں اڑ کر، ان اشیا کا مشاہدہ و معائنہ کرا دینے والے آلات بھی موجود و مروج ہو گئے ہیں، جو نیچے سے قطعی طور پر نظر نہیں آسکتے، پھر ان میں تنوع بھی ہے، جو بیان سے باہر ہے۔ یہ دیکھ کر یہ سوال پیدا ہونا قدرتی بات ہے کہ رؤیتِ ہلال میں ان چیزوں سے مدد لینا شرعاً کیا درجہ و حیثیت رکھتا ہے؟

یہ تو واضح ہے کہ رؤیتِ ہلال کے لیے، ان جدید آلات (مثلاً: دور بین، خورد بین، ہوائی جہاز) کا استعمال واجب و ضروری نہیں ہے، ضروری تو صرف اس قدر ہے کہ فطری اصول کے مطابق چاند دیکھنے کی کوشش کی جائے، اگر نظر آجائے، تو ٹھیک؛ ورنہ مہینے کو تیس دن کا تسلیم کر لیا جائے۔

چناں چہ حدیث میں واضح الفاظ میں ارشاد ہے:

فإن غُمّ عليكم ، فأكملوا عدة شعبان ثلاثين. (۱)

ترجمہ: پس اگر چاند تم پر پوشیدہ ہو جائے تو تیس دن پورے کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ چاند نظر نہ آئے، تو ہم صرف اس بات کے مکلّف ہیں کہ تیس دن پورے کرلیں؛ پہاڑوں پر چڑھ کر، ہوائی جہاز پر اُڑ کر یا دور بین یا خورد بین کی مدد سے، چاند دیکھنے کے مکلّف نہیں ہیں اور نہ ہی ریاضی و فلکیات کے حسابات و علوم سے چاند معلوم کرنے کے مکلّف ہیں۔ مذکورہ بالا حدیث کو پیش کر کے حضرت

(۱) البخاري:۳/۲۵، الرقم:۱۹۰۹، و اللفظ له، المسلم:۵۴۶، الرقم:۱۰۸۱، السنن الكبرىٰ للنسائي:۳/۱۰۰، الرقم:۲۴۳۹، الدارمي :۱۰۴۹، الرقم:۱۷۲۷۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یعنی تمہاری آنکھیں اس کو نہ دیکھ سکیں، تو پھر تم اس کے مکلّف نہیں کہ ریاضی کے حسابات سے چاند کا وجود اور پیدائش معلوم کرو اور اس پر عمل کرو، یا آلاتِ رصدیہ اور دوربینوں کے ذریعے اس کا وجود دیکھو؛ بل کہ فرمایا: " **فإن غم عليكم ، فأكملوا العدة ثلاثين**" یعنی اگر تم پر مستور ہو جائے، تو تیس دن پورے کر کے مہینہ ختم سمجھو۔" (۱)

حافظ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"بل ظاهر السياق يشعر بنفي تعليق الحكم بالحساب أصلاً ، و يوضحهٗ قولهٗ في الحديث الماضي: "فإن غم عليكم فأكملوا العدة ثلاثين "ولم يقل فاسئلوا أهل الحساب ."(۲)

ترجمہ: حدیث (جس میں ہے کہ ہم امی امت ہیں) اس کا ظاہر سیاق (چاند کے) حکم کے حساب پر معلق ہونے کی بالکلیہ نفی کرتا ہے اور اس کی توضیح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کرتا ہے: "اگر تم پر چاند مستور ہو جائے، تو تیس دن پورے کر لو" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ: اہلِ حساب سے پوچھو۔

معلوم ہوا کہ رؤیتِ ہلال کے لیے جدید آلات اور ریاضی کے حسابات سے مدد لینا شرعاً ضروری نہیں ہے، اسی طرح یہ کوئی پسندیدہ و مستحب بات بھی نہیں ہے، زیادہ

(۱) رؤیت ہلال:۱۲

(۲) فتح الباري:۴/۱۶۳

سے زیادہ — بہ شرطے کہ حدودِ شرعیہ سے آگے نہ بڑھا جائے — مباح وجائز ہے اور یہ کہنا صحیح نہیں کہ زمانۂ رسالت ودورِ صحابہ میں جدید آلات اور ریاضی کے حسابات کا سلسلہ نہ تھا کہ اس سے مدد لی جاتی اور آج یہ سب چیزیں فراوانی وترقی کے ساتھ موجود ہیں؛ لہٰذا ان سے مدد لینا چاہیے؛ کیوں کہ ریاضی کے فنون عہدِ رسالت وصحابہ میں؛ بل کہ اس سے بہت پہلے دنیا میں رائج تھے اور اس وقت مختلف مقامات پر بڑی بڑی رصدگاہیں بھی قائم تھیں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں ہے:

''علم ریاضی (ASTRONOMY) بہت قدیم ترین زمانوں سے (اس کے شوقین لوگوں کے ذریعے، جو اپنے فارغ اوقات اور اپنی دولت کو اس میں لگاتے ہیں اور ان ماہرین کے ذریعے، جو ان یونیورسٹیوں اور تعلیم گاہوں میں کام کرتے ہیں، جو حکومتوں کی طرف سے چلائے جاتے ہیں یا ذاتی طور پر چلائے جاتے ہیں) چلا آرہا ہے، حکومتی سطح کی روایت بھی بہت قدیم زمانے سے قائم ہے؛ جب کہ مذہبی رہنما اور دوسرے اعلیٰ درجے کے سرکاری ملازم پہلے ہی سے علمِ ریاضی میں مشغول تھے؛ تاکہ موسم اور کیلنڈر مقرر کیا جائے اور ستاروں کے فال کا مطالعہ کریں''۔(۱)

جارج سارٹن نے مقدمۂ تاریخِ سائنس میں لکھا ہے:

''بابلی فلکیات کا زمانہ بڑا قدیم ہے اور قیاس یہ ہے کہ مغرب نے فلکیات کا علم اسی سرچشمے سے حاصل کیا ہے (آگے لکھتا ہے) ہفتے کے سات دن، دن میں بارہ بارہ گھنٹوں کے دو دور، زاویے کی شصت

(۱) مقدمہ تاریخِ سائنس مترجَم: ۱/ ۱۵۵

گانہ تقسیم، بابل کے علمائے ہیئت نے بہ حوالہ آفتاب، سیارۂ زہرہ کے طلوع وغروب کا حساب، ولادتِ مسیح سے بھی تین ہزار سال پہلے کرلیا تھا‘‘۔(۱)

انسائیکلو پیڈیا سے معلوم ہوا کہ ریاضی کے فنون، دنیا میں قدیم ترین زمانوں سے رائج وعام ہیں اور ’’جارج سارٹن‘‘ کی شہادت سے معلوم ہوا کہ تین ہزار برس قبلِ مسیح ہی سے بابل میں ان فنون کو فروغ حاصل ہو چکا تھا، یہ الگ بات ہے کہ بعد کے ادوار کے لحاظ سے اس وقت یہ فنون محض ابتدائی شکل میں تھے؛ مگر اتنا تو یقینی ہے کہ زمانۂ رسالت وصحابہ تک اس میں بہت کچھ ترقی ہو چکی تھی اور رصدگاہوں کا قیام بھی اس وقت تک عمل میں آچکا تھا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے فرمایا ہے کہ

’’دنیا کی تاریخ پر نظر رکھنے والوں پر یہ بات مخفی نہیں کہ ریاضی کے یہ فنون آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے بہت پہلے دنیا میں رائج تھے اور خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں مصر وشام اور ہندوستان میں رصدگاہیں قائم تھیں‘‘۔(۲)

رہی آلاتِ جدیدہ کی بات، تو اس کا جواب بھی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

عہدِ رسالت میں مانا کہ ہوائی جہاز نہ تھے؛ مگر مدینے میں سلع پہاڑ سامنے کھڑا ہے اس کے اوپر کچھ آبادی بھی ہے، جبلِ احد بھی ساتھ لگا ہوا ہے، مکہ معظّمہ تو سب طرف سے پہاڑوں میں گھرا ہوا

---

(۱) انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا:۳۴۶/۲۔مقالہ ASTRONOMY

(۲) رؤیتِ ہلال:۱۵

ہے، صفا اور مروہ کی پہاڑیاں اور جبلِ ابی قبیس بالکل شہر سے لگے ہوئے ہیں؛ لیکن عہدِ رسالت میں پھر خلافتِ راشدہ اور قرونِ خیر میں کہیں نظر سے نہیں گزرا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ رضی اللہ عنہم نے اتنا اہتمام فرمایا ہو کہ لوگوں کو ان پہاڑوں کے کسی اونچے مقام پر چڑھ کر چاند دیکھنے کے لیے بھیجا ہو"۔(۱)

حاصل یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رؤیتِ ہلال کے لیے جو سادہ اور فطری اصول اپنایا تھا، وہی پسندیدہ ہے؛ لہٰذا آلاتِ جدیدہ اور فنونِ ریاضیہ سے اس میں مدد لینا، نہ واجب ہے، نہ مستحب ہے؛ بل کہ زیادہ سے زیادہ یہ صرف "جائز" ہے، بہ شرطیکہ وہ اسلامی اصول وضابطوں کو مجروح نہ کرتے ہوں، اگر ان سے اسلامی اصول وضوابط کی خلاف ورزی لازم آتی ہو، تو ان سے مدد لینا جائز بھی نہ ہوگا۔

نوٹ: ان اصول وضوابط کا تذکرہ آئندہ صفحات میں اپنے اپنے موقع پر آئے گا۔

ممکن ہے کہ ان حضرات کو جو تجدد پسند واقع ہوئے ہیں اور ان جدید آلات کو زمانے کی ضرورت؛ بل کہ اہم ضرورت خیال کرتے ہیں، یہ بات کھٹکے کہ اسلام رؤیتِ ہلال کے لیے ان آلات وفنون سے مدد لینے کو پسند نہیں کرتا؛ مگر جو حضرات بصارتِ ظاہری کے ساتھ بصیرتِ باطنی سے بھی سرفراز ہیں، وہ یہ بات بہ خوبی جانتے وسمجھتے ہیں کہ اسلام کا یہ طرزِ عمل بڑی حکمت پر مبنی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلام ایک عالم گیر مذہب ہے، جو وطنی ،لسانی اور جغرافیائی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر پورے عالم اور عالم کے ہر فرد کے لیے آیا ہے

---

(۱) آلاتِ جدیدہ: ۱۷۴

اور اس کے احکام کے مکلّف صرف وہ لوگ نہیں ہیں، جو ریاضی کے فنون سے واقف اور آلاتِ جدیدہ سے بہرہ مند ہیں اور نہ صرف وہ لوگ، جو شہروں کی پرتکلف زندگی بسر کرنے والے اور ترقی یافتہ علاقوں میں سکونت پذیر ہیں؛ بل کہ ان فنون سے یکسر ناواقف اور آلاتِ جدیدہ سے کلیۃً بے بہرہ لوگ اور معمولی، چھوٹے چھوٹے دیہات وقریوں میں اور پہاڑوں اور دور افتادہ جزیروں میں بسنے والے بے شمار لوگ بھی ہیں، اگر آلاتِ جدیدہ وفنونِ ریاضیہ سے رویتِ ہلال میں مدد لینا ضروری یا پسندیدہ ومستحب قرار دیا جاتا، تو ظاہر ہے کہ اس حکم کی تعمیل آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی سب کے لیے ممکن نہ تھی، غریب اور پسماندہ طبقات کے لوگ یا تو ترکِ واجب کے مرتکب ہوتے یا فضیلت سے محروم رہ جاتے: اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلامی عبادات واعمال کی انجام دہی میں بھی غریب لوگ امیروں سے پیچھے رہ جاتے، ظاہر ہے کہ غریب وامیر کا یہ فرق اسلامی روح کے سراسر خلاف ہے؛ اس لیے اسلام نے عبادات کے لیے سادہ اور فطری اصول مقرر فرمائے ہیں؛ تا کہ ہر قسم کے لوگ بہ آسانی ان کو اختیار کر کے فرض ادا کر سکیں؛ البتہ جن کو یہ آلات میسر ہوں یا جو اِن فنون سے بہرہ یاب ہوں؛ وہ اگر اِن فنون وآلات کو کام میں لائیں، تو — اس شرط کے ساتھ کہ اسلامی اصول مجروح نہ ہوں — ان کو اجازت دی جائے گی۔

غور کیجیے کہ یہ بات کیا اسلام کے محاسن میں شمار کرنے کے قابل نہیں؟ مگر افسوس کہ آج کا جدت پسند طبقہ، اسلام کی اس فطری سادگی اور سہولت پسندی کو اسلام کے محاسن میں شمار کرنے کو تیار نہیں ہے۔

اختلافِ مطالع کا مسئلہ

قدیم زمانے سے یہ مسئلہ فقہائے کرام کے مابین زیرِ بحث رہا ہے کہ چاند کے

مطالع کا اختلاف (کسی جگہ چاند، کسی دن نظر آئے اور دوسری جگہ دوسرے دن) احکام میں مؤثر ومعتبر ہے یا نہیں؟

مثلاً: مغربی علاقوں میں چاند نظر آ گیا؛ جب کہ ابھی مشرقی علاقوں میں نظر نہیں آیا، تو کیا اس اختلاف کا اعتبار کر کے یہ کہا جائے گا کہ جہاں نظر آ گیا، وہاں کے لوگ روزہ رکھ لیں یا عید کر لیں اور جہاں نظر نہیں آیا، وہاں کے لوگ روزہ نہ رکھیں اور عید نہ کریں؛ یا اس اختلاف کا اعتبار نہ کر کے یہ حکم کیا جائے گا کہ اس رؤیتِ ہلال کی خبر دنیا کے کسی بھی خطے اور علاقے میں پہنچے، وہاں کے لوگوں پر روزہ رکھنا یا عید کرنا لازم ہوگا؟

مگر یہ بات یہاں ذہن نشیں کر لینی چاہیے کہ اس اختلاف کا منشا یہ نہیں ہے کہ چاند کے مطالع میں اختلاف ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہے، نہیں! بل کہ مطالع میں اختلاف کا ہونا ایک مسلمہ حقیقت ہے، جس کو سبھی فقہا وعلما مانتے ہیں؛ کیوں کہ یہ ایک واقعاتی چیز ہے، جو کچھ اختلاف ہے، وہ اس اختلافِ مطالع کے مؤثر ومعتبر ہونے میں ہے کہ بعض معتبر مانتے ہیں اور بعض غیر معتبر قرار دیتے ہیں۔

چناں چہ مشہور حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامی رَحِمَہُ اللہُ نے لکھا ہے:

جاننا چاہیے کہ اختلافِ مطالع میں بہ جائے خود کوئی نزاع و اختلاف نہیں ہے، اس معنیٰ کر کہ کبھی دو شہروں میں اتنا فاصلہ ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک میں فلاں رات چاند طلوع ہو جاتا ہے، دوسرے میں نہیں — آگے چل کر فرمایا — بس اختلاف تو اس اختلافِ مطالع کے اعتبار میں ہے کہ کیا ہر قوم پر اپنے مطلع کا اعتبار کرنا واجب ہے اور دوسرے مطلع کے مطابق ان پر عمل لازم نہیں ہے یا اس

اختلاف کا اعتبار نہیں ہے؛ بل کہ جو پہلے دیکھا گیا، اس پر عمل کرنا واجب ہے؟ حتیٰ کہ اگر مشرق میں جمعے کی رات چاند دیکھا گیا اور مغرب میں ہفتے کی رات، تو مغربی لوگوں پر مشرقی لوگوں کی رویت پر عمل کرنا واجب ہوگا؟[1]

اس سے واضح ہوا کہ مطالع میں فی نفسہٖ اختلاف کا ہونا، فقہائے کرام کے نزدیک مسلم ہے، اختلاف اس کے معتبر ہونے یا نہ ہونے میں ہے، پھر علامہ شامی رحمہ اللہ کے مطابق اختلافِ مطالع کے معتبر ہونے میں جو اختلاف ہے، وہ صرف روزے کے بارے میں ہے، باقی امور جیسے: حج و قربانی وغیرہ کے متعلق اس اختلاف کا سبھی نے اعتبار کیا ہے۔[2]

---

(۱) ردالمختار :۳/۳۶۳

(۲) یہ بات علامہ شامی رحمہ اللہ نے علما کے کلام سے اخذ واستنباط کر کے بیان کی ہے۔

چناں چہ لکھتے ہیں: " **يفهم من كلامهم في كتاب الحج أن اختلاف المطالع فيه معتبر، فلا يلزمهم شيء لو ظهر أنه رئي في بلدة أخرىٰ قبلهم بيوم ، وهل يقال كذالک في حق الأضحية لغير الحجاج ؟ لم أره ، والظاهر نعم ، لأن اختلاف المطالع إنما لم يعتبر في الصوم لتعلقه بمطلق الرؤية .**
(ردالمحتار:۳/۳۶۴)

مگر حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے "امداد الفتاویٰ" میں اور مولانا ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے "إعلاء السنن" میں اس سے اختلاف کیا ہے؛ چناں چہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "علامہ شامی نے ہر چند کہ بناعدمِ قبولِ شہادت کے اعتبار اختلافِ مطالع پر ٹھہرائی ہے؛ مگر اس کو کسی نے صراحۃً نقل نہیں فرمایا؛ بل کہ **يفهم من كلامهم** کہا، جس کے معنے یہ ہیں کہ "ان کے کلام سے یہ اعتبار مستخرج ہوتا ہے، تو اصل حنفیہ کے نزدیک کل جگھوں میں عدمِ اعتبار اختلاف مطالع ٹھہرا"۔ کما ھو ظاھر من إطلاقاتھم۔

اور استنباط علامہ شامی کا مسئلۂ اضحیہ میں اسی بنا پر ہے کہ انہوں ....

غرض یہ کہ فقہائے کرام کے مابین اختلافِ مطالع کے مسئلے میں جو بحث ہوئی ہے، وہ اختلافِ مطالع کے وجود کے بارے میں نہیں ہے، جیسا کہ بعض حقیقت سے ناواقف لوگ گمان کرتے ہیں؛ بل کہ اختلاف اور بحث اس کے معتبر ہونے یا نہ ہونے میں ہے۔

فقہا کے اس میں تین مسلک ہیں:

۱- ایک یہ کہ اختلافِ مطالع کا مطلقاً کوئی اعتبار نہیں، کتبِ فقہِ حنفیہ میں اس کو ظاہر الروایہ بتایا گیا ہے۔(۱)

..........نے عدمِ قبولِ شہادت کو بعض مسائلِ حج میں مبنی براختلافِ مطالع ٹھہرایا؛ حال آں کہ عند التأمل یہ امر غیر صحیح ہے؛ بل کہ اس عدمِ قبول کی وہی حرج ہے، پس جب بنا ہی صحیح نہیں تو مبنیٰ کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے، خصوصاً جب کہ کتبِ مذہب کے خلاف ہو؟''
(امداد الفتاویٰ:۲/ ۱۰۸)

حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ رقم فرماتے ہیں:

واعلم أن عدم اعتبار اختلاف المطالع الظاهر أنه عام لجميع الأهلة ، وفرَّق العلامة الشامي بين هلال رمضان وهلال ذي الحجة استناداً بما قالوا في الحج ، واستدلالاً بتعلق صوم رمضان بمطلق الرؤية في قوله صلی اللہ علیہ وسلم :''صوموا لرؤيته و أفطروا لرؤيته '' هذا بخلاف الأضحية لا يصح ، واستنادهٗ بما قالوا في الحج ساقط ؛ لأن مبناه دفع الحرج بعد وقوع الحج ، لا اعتبار اختلاف المطالع ، فإن تحققت شهادة قبل الحج تقبل '' . (إعلاء السنن:۹/۱۲۰)

(۱) وفي البحر:'' ولا عبرة باختلاف المطالع...... وقيل يعتبر ...... والأول ظاهر الرواية ، وهو الأحوط. كذا في فتح القدير، وظاهر المذهب ، وعليه الفتوىٰ ، كذا في الخلاصة ''. (البحر الرائق:۲/۴۷۱)

وفي الدر: '' واختلاف المطالع غير معتبر على [ظاهر] المذهب'' .
(الدر المختار مع الشامي،۳/۳۶۳)

وفي النور: ''وإذا ثبت في مطلع قطر لزم سائر الناس في ظاهر المذهب وعليه الفتوىٰ ''. (نور الإيضاح مع المراقي:۲۳۷)

نیز حنابلہ(۱) ومالکیہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔(۲)

۲– دوسرا یہ کہ اختلافِ مطالع کا ہر حال میں اعتبار کیا جائے؛ لہٰذا ہر شہر والے اپنے مطلع اور رؤیت کے مطابق عمل کریں گے۔ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ نے بتایا کہ یہ قول حضرت عکرمہ، حضرت قاسم، حضرت سالم، وحضرت اسحاق رحمہم اللہ سے مروی ہے۔(۳)

---

(۱) وفي الكشف :" و إذا ثبتت رؤية الهلال بمكان قريباً كان أوبعيداً ، لزم الناس كلهم الصوم ، وحكم من لم يره حكم من رآه ". (كشف القناع :۲/۱۲۷)

وفي المبدع: " وإن رأى الهلالَ أهل بلد ، لزم الناس كلهم الصوم[وظاهرهُ لا فرق بين قرب المكان أوبعده]". (المبدع شرح المقنع:۳/۷)

وفي الكافي: " وإذا رأى الهلال أهل بلد ، لزم الناس كلهم الصوم ". (الكافي : ۲/ ۲۳۰)

وفي المحرر :"ورؤية بعض البلاد رؤية لجميعها ". (المحرر في الفقه :۱/ ۲۲۸)

(۲) وفي الكافي :"و إذا رأى الهلال في مدينة أو بلد ، رؤيةً ظاهرةً ، أو ثبتت رؤيتهُ بشهادة قاطعة ، ثم نقل ذٰلک عنهم إلیٰ غيرهم بشهادة شاهدين ؛ لزمهم الصوم ولم يجز لهم الفطر ". (الكافي في فقه أهل المدينة:۱۲۰)

وفي الشرح الصغير: "[وعم] الصوم سائر البلاد والأقطار ولو بعدت [إن نقل عن المستفيضة أو]عن [العدلين بهما] ". (الشرح الصغير:۱/۶۸۴)

وفی الشرح الكبير:"[وعم]الصوم سائر البلاد قريباً أو بعيداً ولا يراعیٰ في ذٰلک مسافة قصر، ولا اتفاق المطالع و لا عدمها ؛ فيجب الصوم علیٰ كل منقول إليه [إن نقل بهما عنهما]". (حاشية الدسوقي علیٰ الشرح الكبير:۱/۵۱۰)

وفی العقد:وإذا رأى الهلال في بلد لزم غيرهم الصوم بذلک. (عقدالجواهرالثمينة:۱/۳۵۶)

(۳) قال ابن حجر: لأهل كل بلد رؤيتهم.... وحكاه ابن المنذر عن عكرمة والقاسم وسالم وإسحاق رحمهم اللہ. فتح الباري:۴/ ۱۵۸

۳- تیسرا یہ کہ بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا جائے گا اور بلادِ قریبہ میں نہیں کیا جائے گا، اسی مسلک کو اکثر فقہائے مذاہب نے ترجیح دی ہے اور خود حنفی فقہا نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، علامہ عبدالحئ لکھنوی رحمہ اللہ نے یہ مسلک علامہ طحطاوی، صاحبِ **تجريد القدوري**، صاحب **فتاویٰ التاتار خانية**، صاحب **الهداية**، علامہ زیلعی رحمہم اللہ وغیرہ فقہائے احناف سے نقل کیا ہے اور خود علامہ عبدالحئ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

واصح المذاہب عقلاً ونقلاً ہمیں است کہ ہر دو بلدہ کہ فیما بین آنہا ''مسافتے باشد کہ دراں اختلافِ مطالع می شود و تقدیرِ مسافت یک ماہ است، دریں صورت حکمِ رؤیت یک بلدہ ببلدہ دیگر نخواہد شد، ودر بلادِ متقاربہ کہ مسافت کم از یک ماہ داشتہ باشد حکمِ رؤیت یک بلدہ ببلدۂ دیگر خواہد شد۔''(۱)

ترجمہ: عقلاً ونقلاً سب سے زیادہ صحیح مذہب یہ ہے کہ جن دو شہروں میں اتنی مسافت ہو کہ اس میں مطلع بدل جاتا ہو، جس کا اندازہ یک ماہ کی مسافت ہے، ان میں ایک شہر کی رؤیت دوسرے شہر کے لیے معتبر نہ ہوگی اور قریبی شہروں میں جن کے درمیان ایک ماہ سے کم کی مسافت ہو، ایک شہر کی رؤیت کا حکم دوسرے شہر کے لیے ہوگا۔

نیز علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں جیسا کہ علامہ یوسف بنوری رحمہ اللہ نے شرحِ ترمذی میں نقل کیا ہے اور وہ خود بھی اسی کے قائل ہیں۔(۲)

---

(۱) **مجموعة الفتاویٰ**:۲/۱۳۴-۱۳۵

(۲) **راجع إلى معارف السنن**:۵/۳۳۷

نیز علامہ شبیر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللہُ نے "**فتح الملهم**" میں اس کو اصح و راجح قرار دیا ہے۔(۱)

اور علامہ مفتی شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ نے بھی اس کو ترجیح دی ہے۔ وہ اپنے رسالے "رؤیتِ ہلال" میں فرماتے ہیں:

"آج تو ہوائی جہازوں نے ساری دنیا کے مشرق و مغرب کو ایک کر ڈالا ہے، ایک جگہ کی شہادت دوسری جگہ پہنچنا قضیہ (مشکل مسئلہ) نہیں؛ بل کہ روز مرہ کا واقعہ بن گیا ہے اور اس کے نتیجے میں اگر مشرق کی شہادت مغرب میں اور مغرب کی مشرق میں حجت مانی جائے، تو کسی جگہ مہینہ اٹھائیس دن کا، کسی جگہ اکتیس دن کا ہونا لازم آجائے گا؛ اس لیے ایسے بلادِ بعیدہ میں جہاں مہینے کے دنوں میں کمی بیشی کا امکان ہو، اختلافِ مطالع کا اعتبار کرنا ہی ناگزیر اور مسلکِ حنفیہ کے عین مطابق ہوگا۔"(۲)

"مجلسِ تحقیقاتِ شرعیہ ندوۃ العلما، لکھنؤ" کے اجلاس منعقدہ ۳/۴ مئی ۱۹۶۷ء کی تجویز و فیصلہ، جس پر مختلف مکاتبِ فکر کے علما اور مختلف اداروں کے نمائندوں نے اتفاق کیا تھا، اس میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ

"نفس الامر میں پوری دنیا کا مطلع ایک نہیں ہے؛ بل کہ اختلافِ مطالع مسلَّم ہے، یہ ایک واقعاتی چیز ہے، اس میں فقہائے کرام کا کوئی اختلاف نہیں؛ البتہ فقہا اس بات میں مختلف ہیں کہ صوم و افطارِ صوم کے باب میں یہ اختلافِ مطلع معتبر ہے یا نہیں؟ محققینِ احناف اور

---

(۱) فتح الملهم: ۳/۱۱۳

(۲) رؤیت ہلال: ۴۷

علمائے امت کی تصریحات اوران کے دلائل کی روشنی میں مجلس کی متفقہ رائے ہے کہ بلادِ بعیدہ میں اس باب میں بھی اختلافِ مطلع معتبر ہے''۔ (۱)

اس تفصیل سے یہ بات نہایت وضاحت سے سامنے آگئی کہ جمہور علمائے احناف بھی (خصوصاً اس آخری دور میں) اسی کے قائل ہیں کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار کیا جانا چاہیے۔

اورعلامہ یوسف بنوری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس جگہ ایک لطیف بات فرمائی ہے،جس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ائمۂ مذاہب کا قول بھی اختلافِ مطالع کے اعتبار ہی کا ہے،علامہ موصوف رَحِمَہُ اللّٰہُ کی تقریر کا خلاصہ یہ ہے کہ

''ائمۂ کرام سے تو صرف اختلافِ مطالع کے عدمِ اعتبار کا ایک اجمالی قول بغیر کسی تفصیل اور بغیر قرب و بعد کی تفریق کے مطلقاً منقول ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ اس زمانے کے نظامِ مواصلات اور قطعِ مسافت کے نظامِ معہود کے لحاظ سے ایک ماہ کے اندر اندر اتنی دور کی مسافت کا طے کرنا،جس سے کہ چاند کا مطلع مختلف ہو جائے، ممکن نہ تھا؛ یہ بات ناممکن تھی کہ کوئی شخص چاند دیکھے، پھر ایک ماہ سے پہلے ایسی جگہ پہنچ جائے، جہاں کا مطلع پہلی جگہ کے مطلع سے مختلف ہو؛ اس لیے اگر کوئی خبر پہلے پہنچ گئی،تو یہ سمجھا جاتا کہ مطلع ایک ہے؛ لہٰذا شرعاً اس رؤیت کے اعتبار کو لازم قرار دیا گیا اور اختلافِ مطلع کے عدمِ اعتبار کا قول اسی جہت سے آیا ہے؛ پھر لوگوں نے اس قول کو وسعت دی اور ہر مطلع کے لیے عام کر دیا؛ مگر یہ میرے نزدیک

---

(۱) بہ حوالہ رؤیتِ ہلال از: مولانا محمد میاں صاحب:۱۰۴

مناسب نہیں ہے؛ بل کہ ضروری ہے کہ اس زمانے کے احوال و ظروف اور ان کے اغراض و مقاصد کی بھی رعایت کی جائے''۔ (۱)

غرض یہ کہ بلادِ بعیدہ میں اختلافِ مطالع کا معتبر ہونا ہی قرینِ قیاس اور اکثر علما کا اختیار کردہ قول و مذہب ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ شہروں میں قرب و بعد کا معیار کیا ہے؟ بہ الفاظِ دیگر کن شہروں اور علاقوں کو ہم متحد المطلع اور کن کو مختلف المطلع قرار دیں؟ تو اس سلسلے میں بھی فقہا کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے؛ بعض فقہائے کرام نے ایک ماہ کی مسافت کو معیار قرار دیا ہے کہ جن دو شہروں کے مابین اتنی مسافت ہو، جو ایک ماہ میں طے کی جا سکے گی، تو یہ شہر و علاقے مختلف المطلع ہوں گے اور جن کے درمیان اس سے کم مسافت ہو، وہ ''متحد المطلع ہوں'' گے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے بہ حوالہ ''جواہر''، اس کو علامہ قہستانی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے اور علامہ تاج تبریزی رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ ۲۴/ فرسخ سے کم میں مطلع کا

---

(۱) معارف السنن: ۵/ ۳۳۸-۵/ ۳۳۹، اس تحریر کے بعد علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ کی ایک تحریر ان کے فتاویٰ میں نظر سے گزری، جو علامہ بنوری رحمہ اللہ کی بات کی تائید کرتی ہے؛ لہٰذا اس کو نقل کرتا ہوں:

وهي هٰذه: فالضابط أن مدار هٰذا الأمر (أي قضاء الصوم) على البلوغ لقولهٖ ''صوموا لرؤيته'' فمن بلغ أنهٗ رأى ثبت في حقه من غير تحديد بمسافة أصلاً، و هٰذا يطابق ما ذكره ابن عبدالبر في طرفي المعمورة لايبلغ الخبر فيهما إلا بعد شهر فلا فائدة فيه ؛ بخلاف الأماكن الذي يصل الخبر فيها قبل انسلاخ الشهر، فإنها محل الاعتبار. (مجموعة الفتاوىٰ :۲۵/ ۱۰۷)

(الناقل :شعیب اللّٰہ خان)

اختلاف ممکن نہیں ہے۔(۱)

محولہ بالا ''مجلسِ تحقیقاتِ شرعیہ'' کی تجویز میں لکھا گیا ہے:

''بلادِ بعیدہ سے مراد یہ ہے کہ ان میں باہم اس قدر دوری واقع ہو کہ عادتاً ان کی رؤیت میں ایک دن کا فرق ہوتا ہو، ایک شہر میں ایک دن پہلے چاند نظر آتا ہے اور دوسرے میں ایک دن بعد، ان بلاد میں اگر ایک کی رؤیت دوسرے کے لیے لازم کردی جائے، تو مہینہ کسی جگہ ۲۸؍دن کا رہ جائے گا اور کسی جگہ ۳۰؍دن کا قرار پائے گا''۔(۲)

یہ رائے نہایت متوازن ہونے کے ساتھ سہل العمل بھی ہے؛ لہٰذا اسی پر عمل درآمد کرنا قرینِ مصلحت معلوم ہوتا ہے، باقی اس سلسلے میں فلکیاتی تحقیقات سے بھی مدد لی جاسکتی ہے اور مطلع کی حدیں اس کے ذریعے مقرر کی جاسکتی ہیں۔

یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ ہندوستان و پاکستان کا مطلع ایک ہے، اس طرح بعض قریبی ممالک، جیسے: ''بنگلہ دیش'' اور ''نیپال'' کا مطلع بھی وہی ہے، جو ہندوستان اور پاکستان کا مطلع ہے؛ لہٰذا ان میں سے ایک جگہ کی رؤیت دوسری جگہ معتبر ہوگی؛ جب کہ وہ بہ طریقِ موجب دوسری جگہ پہنچ جائے اور عرب ممالک کا مطلع ہندوستان کے مطلع سے الگ ہے؛ لہٰذا وہاں کی رویت کا یہاں یا یہاں کی رویت کا وہاں اعتبار نہ ہوگا؛ چناں چہ ''مجلسِ تحقیقاتِ شرعیہ'' کی محولہ بالا تجویز میں باتفاق لکھا گیا ہے:

''ہندوستان و پاکستان کے بیشتر حصوں اور بعض قریبی ملکوں،

---

(۱) قال الشامي: وقدر البعد الذي تختلف فيه المطالع مسيرة شهر فأكثر علىٰ ما في القهستاني عن الجواهر. (الشامي:۳/۳۶۳)

(۲) رؤیتِ ہلال: از مولانا میاں صاحب:۱۰۴

مثلاً: نیپال وغیرہ کا مطلع ایک ہے۔علمائے ہندو پاک کا عمل ہمیشہ اسی پر رہا ہے اور غالباً تجربے سے بھی یہی ثابت ہے،ان ملکوں کے شہروں میں اس قدر بُعدِ مسافت نہیں ہے کہ مہینے میں ایک دن کا فرق پڑتا ہو؛ اس بنیاد پر ان دونوں ملکوں میں جہاں بھی چاند دیکھا جائے، شرعی ثبوت کے بعد اس کا ماننا، ان دونوں ملکوں کے تمام اہلِ شہر پر لازم ہوگا،مصر وحجاز جیسے دُور دراز ملکوں کا مطلع ہندو پاک کے مطلع سے علاحدہ ہے، یہاں کی رؤیت ان ملکوں کے لیے اور ان ملکوں کی رؤیت یہاں والوں کے لیے ہر حالت میں لازم و قابلِ قبول نہیں ہے؛ اس لیے کہ ان میں اور ہندو پاک میں اتنی دوری ہے کہ عموماً ایک دن کا فرق ان میں واقع ہو جاتا ہے اور بعض اوقات، اس سے بھی زیادہ۔“ (۱)

رہا یہ سوال کہ اگر ان علاقوں میں سے کسی جگہ ۲۹/ تاریخ کو رؤیت ہو جائے اور وہاں اس کا اعلان بھی کر دیا جائے، تو دوسرے علاقوں کے لوگ اس کے مطابق عمل کر سکتے ہیں یا اپنے قاضی یا جہاں قاضی نہ ہو، وہاں رؤیتِ ہلال کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کریں؟ اور یہ کہ کیا دوسرے علاقوں کے قاضی یا رؤیتِ ہلال کمیٹی اس اعلان کی پابند ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں دو صورتیں ہیں:

۱- رمضان کا چاند ۲۹/ تاریخ کو دیکھا جائے اور اس کا اعلان کیا جائے، تو اس صورت میں دوسرے علاقے کے اہلِ اسلام تک اس کی خبر بہ طریقِ موجب پہنچے، تو ان کے لیے درست ہے کہ اس کے مطابق عمل کرتے ہوئے وہ روزہ رکھیں؛ کیوں

---

(۱) رؤیتِ ہلال از: مولانا میاں صاحب: ۱۰۴-۱۰۵

کہ رمضان کے لیے حسبِ تصریحاتِ فقہ، قابلِ اعتماد خبر کافی ہے۔

۲۔ عید کا چاند ۲۹/ تاریخ کو دیکھ کر اس کا اعلان کیا گیا ہو، تو اس صورت میں دوسرے علاقوں کے مسلمان محض خبر پر اعتماد نہیں کر سکتے، بل کہ فقہا کی تصریحات سے ثابت ہے کہ عید کے چاند میں با قاعدہ شہادتِ شرعیہ کا ہونا ضروری ہے؛ لہٰذا مقامی قاضی اور قاضی نہ ہونے کی صورت میں کوئی عالمِ ثقہ یا معتمد کمیٹی کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ شہادت حاصل کر کے فیصلہ کرے اور مسلمانوں کے ذمہ ہوگا کہ ان کا انتظار کریں۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ رمضان کے چاند کی صورت میں خبرِ صادق کے پہنچنے پر اس کے مطابق عمل جائز ہے؛ مگر عید کے لیے شہادت کے ضروری ہونے کی وجہ سے صرف کسی خبر پر افطار درست نہیں؛ لہٰذا قاضی کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہیے۔

جہاں قاضی ہو، وہاں کا حکم تو صاف ہے کہ فیصلے کے لیے قضا کا انتظار ضروری ہے؛ البتہ جہاں قاضی نہ ہو، جیسے ہندوستان کے اکثر شہروں کا حال ہے، تو اس

---

(۱) البحر الرائق میں ہے: "وقبل بعلة خبر عدل ، ولو قنا أو أنثیٰ لرمضان ، وحرين أو حروحرتين للفطر؛ لأن صوم رمضان أمر ديني ، فأ شبه رواية الأخبار، ولهذا لا يختص بلفظ الشهادة -إلیٰ أن قال – وأما هلال الفطر فلأنهٗ تعلق بهٖ نفع العباد وهو الفطر ، فأشبه سائر حقوقهم ، فيشترط فيه ما يشترط في سائر حقوقهم من العدالة والحرية والعدد وعدم الحد في قذف ولفظ الشهادة والدعوى ،الخ." (البحر الرائق:۲/ ۲۶۶-۲۶۷)

اور در المختار میں ہے: " وقبل بلا دعویٰ وبلا لفظ " أشهد " وبلا حكم ومجلس قضاء ؛ لأنهٗ خبر لا شهادة للصوم مع علة كغيم وغبار، خبر عدل أو مستور –ولو كان العدل قنا أو أنثیٰ أو محدوداً في قذف تاب– وشرط للفطر مع العلة والعدالة نصاب الشهادة ولفظ "أشهد" الخ." (الشامي:۲/ ۳۸۵-۳۸۶)

سلسلے میں عظ صاحبِ ''بحر و درمختار ''دونوں نے تصریح کی ہے کہ ایسے علاقوں میں ضرورت کی وجہ سے شہادتِ شرعیہ ساقط ہوجائے گی اور صرف دو ثقہ معتبر آدمیوں کی خبر پر افطار کیا جاسکتا ہے۔(۱)

اور علامہ بنوری رحمہ اللہ نے اسی پر یہ فرمایا ہے کہ

جہاں شرعی قاضی نہیں ہے، وہاں شہادتِ شرعیہ گزارنا نہیں چاہیے؛
بل کہ عید میں صرف دو عادل آدمیوں کی خبر پر عید کرنا چاہیے۔(۲)

مگر حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے ''عمدة الرعاية '' میں اس کے خلاف یہ لکھا ہے کہ ثقہ عالم حاکم کے قائم مقام ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

'' و العالم الثقة في بلدة لا حاكم فيها ، قائم مقامهٗ '' . (۳)

اور حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) علامہ حصکفی رحمہ اللہ کہتے ہیں:''ولو كان ببلدة لاحاكم فيها ، صاموا بقول ثقة و أفطروا بإخبار عدلين مع العلة للضرورة –قولهٗ : لا حاكم فيها : أي لا قاضي و لا والي كما في '' الفتح '' ، قوله : للضرورة : أي ضرورة عدم وجود حاكم يشهد عنده '' (الشامي: ۲/۳۸۵-۳۸٦)

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے فرمایا کہ:'' أنهم لو كانوا ببلدة لا قاضي فيها ولا والي ؛ فإن الناس يصومون بقول الثقة ويفطرون بإخبار عدلين للضرورة . ''

(البحر الرائق: ۲/۲٦۷)

(۲) علامہ کی عبارت یہ ہے: '' اعلم أن بلاد الهند اليوم ليست فيها حكومة إسلامية وليس فيها دار قضاء المسلمين ، فالحكم في مثلها الصوم بإخبار ثقة والفطر بقول ثقتين ، ولا ينبغي لعلماء العصر من المفتين المشي علىٰ ما هو شان قضاء دار الإسلام من الشهادة وغيرها.'' (معارف السنن:۵/۳۴۵)

(۳) عمدة الرعاية : ۱/۲۴٦، حاشیہ:۸

''جن ملکوں میں اسلامی حکومت نہیں ہے یا ہے؛ مگر باقاعدہ شرعی قاضی مقرر نہیں ہیں، وہاں شہر کے عام دین دار مسلمان جس عالم یا جماعت پر مسائلِ دینیہ میں اعتماد کرتے ہوں، اس شخص یا جماعت کو قاضی کے قائم مقام سمجھا جائے گا اور رؤیتِ ہلال میں اس کا فیصلہ واجب التعمیل ہوگا۔''(۱)

زمانے کے موجودہ حالات کے لحاظ سے بھی بہتر یہی ہے کہ جہاں قاضی نہ ہو، وہاں کسی معتبر عالمِ دین یا جماعت و کمیٹی کے فیصلے کا انتظار کیا جائے؛ تاکہ انتشار وافتراق سے بچا جاسکے۔

رؤیتِ ہلال اور جدید فلکیات

عصرِ حاضر نے جہاں اور چیزوں میں نت نئی تحقیقات اور حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں، وہیں فلکیاتی علوم وفنون کو بھی بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے اور اس سے بھی حیرت انگیز انکشافات سامنے لائے گئے ہیں، اسی کی ایک کڑی یہ ہے کہ ایسے چارٹ اور نقشے تیار کر لیے گئے ہیں، کہ جن کے ذریعے پوری دنیا کے مختلف بڑے بڑے شہروں اور مشہور علاقوں میں متعدد سالوں تک ہر نئے چاند (NEW MOON) کی تاریخ اور امکانی وقت دریافت کرنا آسان ہو گیا ہے، ملیشیا یونیورسٹی کے پروفیسر اور مسلمان سائنس دان ''ڈاکٹر محمد الیاس'' نے بھی اس قسم کا ایک عالمی نقشہ تیار کیا ہے، جس سے ۳۱/سال تک نئے چاند کا وقت و تاریخ معلوم کر سکتے ہیں۔(۲)

---

(۱) رؤیتِ ہلال: ۱۵

(۲) دیکھو: تعمیرِ حیات، لکھنؤ: شمارہ: ۱۰/نومبر ۱۹۸۸ء

ان چیزوں کے پیشِ نظر فقہی مباحث میں ایک بحث یہ پیدا ہوگئی ہے کہ" چاند کی پہلی تاریخ کا فیصلہ رؤیت پر معلق کرنے کے بہ جائے، اگر ان جدید فلکیاتی تحقیقات سے فائدہ اٹھا کر، ان سے ہی اس مسئلے کو حل کرلیا جائے، تو کیا شرعی نقطۂ نظر سے اس کی گنجائش ہے"؟

یہ مسئلہ قدیم فقہا کے درمیان بھی زیرِ بحث آیا ہے اور بعض فقہا نے اس پر مستقل رسائل لکھے ہیں، علامہ سبکی شافعی رحمہ اللہ کے رسالے کا ذکر علامہ شامی رحمہ اللہ نے کیا ہے، علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اس پر مستقل رسالہ لکھا ہے، جو ان کے فتاویٰ میں شامل ہے اور بعض حضرات نے فتاویٰ میں اس پر مستقل کلام فرمایا ہے۔ اس مسئلے پر ہم کسی قدر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں؛ تاکہ حتی الامکان اس کا ہر پہلو واضح و مدلل ہو۔

قدیم فقہا کا مذہب

یہ کہنے کی حاجت نہیں کہ فلکیاتی علوم کو اگرچہ ترقی تو موجودہ دور میں ہوئی ہے؛ مگر ان علوم پر قدیم زمانے سے محنت ہو رہی ہے اور اس کے ماہرین، ہر دور میں رہے ہیں اور ان علوم کے لیے دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں بڑے بڑے مراکز قائم رہے ہیں؛ اس لیے قدیم فقہا کے درمیان یہ مسئلہ زیرِ بحث آیا ہے اور ان حضرات نے اس پر غور و فکر کے بعد اپنی آرا کا اظہار بھی کیا ہے؛ چناں چہ حضراتِ "مالکیہ"، "حنابلہ" اور "حنفیہ" کے نزدیک حسابی طریقے یا آلاتِ رصدیہ کے ذریعے ثابت ہونے والے چاند پر عید و رمضان کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا؛ بل کہ خود اس حسابی طریقے سے چاند معلوم کرنے والے کو بھی اپنی اس تحقیق پر عمل کرتے ہوئے رمضان اور عید کرنا واجب نہیں۔ (۱)

---

(۱) چناں چہ مالکیہ کا مسلک یہ ہے:...

....

’’فمن تسبب لهٗ بغير البصر معتمداً على الحساب لم يوجد في حقه السبب ، فلا يرتب عليه حكم ؛ فلو كان الإمام يرىٰ الحساب فأثبت الهلال بهٖ ، لم يتبع لإجماع السلف علىٰ خلافهٖ‘‘ . (الذخيرة:۲/۴۹۳)

اورحنابلہ کا مسلک یہ ہے کہ:

’’ من صام بنجوم أو حساب لم يجزئه و إن أصاب. ولا يحكم بطلوع الهلال بهما ؛ لأنهٗ ليس بمستند شرعي‘‘ . (كتاب الفروع: ۴/۴۱۲-۴۱۳)

علامہ عاصمی نجدی حنبلی رَحِمَہُ اللہُ نے اس مسئلے کے حوالے سے بڑا ہی زبردست کلام کیا ہے، بہ غرضِ افادہ، پورا کلام پیش ہے:

’’وأجمعوا علىٰ أنهٗ لااعتبار بالحساب ؛ لقوله صَلَّى اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم ’’صوموا لرؤيتهٖ وأفطروا لرؤيتهٖ ‘‘ ولم يقل : للحساب. وقال الشيخ :المعتمد علىٰ الحساب في الهلال كما أنهٗ ضال في الشريعة ، مبتدع في الدين ، فهو مخطيء في العقل والحساب ، فإن العلماء بالهيئة يعرفون أن الرؤية لاتنضبط بأمر حسابي ، وإنما غاية الحساب منهم إذا عدل ، أن يعرف كم بين الهلال و الشمس درجة ، وقت الغروب مثلاً ؛ لكن الرؤية ليست مضبوطة بدرجات محدودة ، فإنها تختلف باختلاف حدة النظر وكلالهٖ ، وارتفاع المكان الذي يتراءى فيه الهلال ، وانخفاظهٖ ، وباختلاف صفاء الجو، وكدره ، وقديراه بعض الناس لثمان درجات ، وآخرون لا يرونهٗ لثنتي عشرة درجة ، فيجب طرحهٗ، والمعول بما عول عليه الشرع‘‘. (حاشية الروض المربع:۳/۳۵۹)

اوراحناف کا مسلک یہ ہے:

[لا عبرة بقول المؤقتين] لا يعتبر قولهم بالإجماع ، ولا يجوز للمنجم أن يعمل بحساب نفسه . (الشامي :۳/۳۵۴)

وأشارالمصنف إلىٰ أنهٗ لا عبرة بقول المنجمين. قال في غاية البيان: ومن قال ’’يرجع فيه إلىٰ قولهم ، فقد خالف الشرع‘‘ . (البحر الرائق: ۲/۴۶۰)..................

بل کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ اہلِ نجوم کے قول پر بالاجماع اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور خود اہلِ نجوم کو بھی اپنے حساب پر عمل کرنا جائز نہیں۔ (۱)

شوافع کا مسلک "الفقه على المذاهب الأربعة" میں یہ نقل کیا ہے کہ

منجم کا قول خود اس کے حق میں اور اس کی تصدیق کرنے والے کے حق میں قابل اعتبار ہے۔ (۲)

مگر دوسرے علما کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں؛ بل کہ حضراتِ شوافع بھی جمہور کی طرح اسی کے قائل ہیں کہ حسابی طریقے پر اعتماد کرنا جائز نہیں۔ ہاں! شوافع میں سے بعض حضرات کا یہ مسلک ہے، جس پر خود حضرات شوافع نے نکیر فرمائی ہے؛ چناں چہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ

علامہ سبکی رحمہ اللہ نے، جو اہلِ حساب پر اعتماد کو جائز کہا ہے، اس پر متأخرینِ شافعیہ نے رد کیا ہے، جن میں ابنِ حجر اور رملی رحمہما اللہ ہیں اور آخر میں لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ کے تمام اصحاب سوائے چند نادر لوگوں کے اس پر متفق ہیں کہ اہلِ نجوم کے قول پر اعتماد نہیں کیا جائے گا۔ (۳)

.... و لا يعتبر قول المنجمين بالإجماع، ومن رجع إلى قولهم فقد خالف الشرع. (البناية للعيني: ۳/۶۱۳)

نقل في الهندية: وهل يرجع إلىٰ أهل الخبرة العدول ممن يعرف علم النجوم؟ الصحيح أنه لا يقبل، كذا في "سراج الوهاج"، ولا يجوز للمنجم أن يعمل بحساب نفسه، كذا في "معراج الدراية". (الفتاوى الهندية: ۱/۲۱۷)

(۱) الشامي: ۳/۳۵۴

(۲) الفقه على المذاهب الأربعة: ۱/۵۵۱

(۳) الشامي: ۳/۳۵۴

علامہ حموی رحمہ اللہ نے حاشیۂ اشباہ میں شافعی مذہب کی کتاب ''التھذیب'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''لایجوز تقلید المنجم في حسابہ ، لا في الصوم ولا في الإفطار''.

ترجمہ: نجومی کی تقلید اس کے حساب میں جائز نہیں ہے، نہ روزے میں نہ افطار میں۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ حساب کے اقوال پر اعتماد کر کے روزہ رکھنا یا روزوں کو ختم کرنا، شوافع کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، بس ائمۂ اربعہ اور ان کے اصحاب و اتباع کا یہی قول ہے۔(۲)

فلکیاتی حساب پر اعتماد، اجماع کے خلاف ہے

بل کہ علما نے تصریح کی ہے کہ فلکیاتی حساب پر اعتماد کرنا خلافِ اجماع ہے؛ گویا ان چند شاذ اقوال کو چھوڑ کر، پوری امت اس پر متفق ہے کہ اہلِ حساب کے قول پر اعتماد جائز نہیں ہے؛ البتہ روافض کا قول ہے کہ حساب پر اعتماد کیا جائے، علامہ ابنِ حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ

''ایک قوم اس طرف گئی ہے کہ اس میں اہلِ حساب کی طرف رجوع کیا جائے اور یہ روافض ہیں، علامہ باجی رحمہ اللہ نے فرمایا

---

(۱) الحموي علی الأشباہ: ۲/۶۶

(۲) جمہور حضراتِ شوافع کا بھی مسلک وہی ہے، جو ائمۂ ثلاثہ کا ہے، اس کے لیے دیکھیے:
المجموع شرح المھذب:۶/ ۲۸۸ - ۲۹۰، روضۃ الطالبین: ۲/۲۱۰-۲۱۱، الحاوي الکبیر:۳/ ۴۰۷-۴۰۹

کہ سلفِ صالح کا اجماع ان کے خلاف حجت ہے اور علامہ ابنِ بریزہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا یہ ''باطل مذہب ہے''۔ (۱)

علامہ ابنِ تیمیہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنی عادت کے مطابق اس پر بہت طویل کلام کیا ہے، وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

''بلاشبہ ہم دینِ اسلام میں سے اس بات کو بالاضطرار جانتے ہیں کہ روزہ، حج، عدت، ایلا؛ وغیرہ چاند سے متعلق احکام میں حساب دان کی اس خبر پر کہ وہ (چاند) نظر آئے گا یا نہیں آئے گا؛ عمل کرنا جائز نہیں اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہو چکا ہے اور اس بارے میں نہ کوئی پرانا اختلاف معلوم ہے نہ کوئی نیا اختلاف۔ ہاں! بعض متاخرین فقہا، جو تیسری صدی کے بعد ہوئے ہیں، انہوں نے یہ گمان کیا کہ جب چاند مستور ہو جائے، تو حساب جاننے والے کو اپنے حساب پر عمل کرنا جائز ہے، یہ قول اگر چہ چاند کے مستور ہونے کی صورت کے ساتھ مقید اور حساب دان کے لیے مختص ہے؛ مگر شاذ ہے اور اس کے خلاف پہلے اجماع ہو چکا ہے۔'' (۲)

---

(۱) قال العسقلاني: وذهب قوم إلىٰ الرجوع إلى أهل التسيير ، وهم ''الروافض'' ونقل عن بعض الفقهاء موافقتهم ، قال الباجي رَحِمَہُ اللّٰہُ :وإجماع السلف الصالح حجة عليهم . وقال ابن بريزة رَحِمَہُ اللّٰہُ :وهو مذهب باطل ، فقد نهت الشرع عن الخوض في علم النجوم لأنها حدس وتخمين ليس فيها قطع ولا ظن غالب ، مع أنه لو ارتبط الأمر بها لضاق إذ لا يعرفها إلا القليل .

(فتح الباري: ۴/۱۶۳)

(۲) فتاویٰ ابن تيمية : ۲۵/۱۳۳

اہلِ حق میں سے جو حضراتِ فقہا و علما اہلِ حساب پر اعتماد کے قائل ہیں، وہ گنے چنے ہیں، جن کا خلافِ اجماع کے لیے مضر نہیں ہے، ان حضرات میں ایک ''محمد بن مقاتل'' کا نام آتا ہے، جو اہلِ حساب کے قول پر اس وقت اعتماد کرتے تھے؛ جب کہ ان کی ایک جماعت متفق ہوتی؛ مگر ان پر علامہ سرخسی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے رد کیا ہے۔ (۱)

دوسرے ''قاضی عبد الجبار'' ہیں اور ایک صاحب ''جمع العلوم'' ہیں، ان سے بھی نقل کیا گیا ہے کہ اہلِ نجوم پر اعتماد کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ (۲)

شوافع میں سے علامہ سبکی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا نام لیا جاتا ہے، جو اہلِ ہیئت کے حساب پر اعتماد کے قائل تھے اور اس سلسلے میں انھوں نے رسالہ بھی لکھا ہے؛ مگر محققین شوافع نے ان پر رد کیا ہے، جیسا کہ اوپر گذرا اور ابنِ حجر رَحِمَہُ اللّٰہُ نے بعض اور نام بھی اس سلسلے میں ذکر کیے ہیں، ابنِ سریج شافعی، مطرف بن عبد اللہ تابعی اور ابنِ قتیبہ محدث رحمہم اللہ؛ مگر ان پر علما نے رد کیا ہے اور ان کے قول کو اجماع کے خلاف قرار دیا ہے۔ (۳)

جمہور علما کے دلائل

۱- جمہور علما کے دلائل یہ ہیں کہ صوم و افطارِ صوم کے بارے میں نبی کریم

---

(۱) قال ابن نجیم :" قال بعض أصحابنا : لا بأس بالاعتماد علیٰ قول المنجمین وعن محمد بن مقاتل أنهٗ کان یسألهم ویعتمد علی قولهم بعد أن یتفق علیٰ ذٰلک جماعة منهم . ورَدَّهٗ الإمام السرخسي رَحِمَہُ اللّٰہُ بالحدیث ".
(الأشباه والنظائر، لابنِ نجیم:۲/۶۶)

(۲) فنقل أولاً عن "القاضي عبد الجبار" و"صاحب جمع العلوم" أنه لا بأس بالاعتماد علی قولهم ۔ (ردالمحتار:۳/۳۵۵)

(۳) دیکھو: فتح الباري:۴/۱۵۷

صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں واضح طور پر حکم دیا ہے:

«عن ابن عمر رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم : الشهر تسع و عشرون ، فلا تصوموا حتى تروه ولا تفطروا حتى تروه ؛ فإن غم عليكم ، فاقدروا له ثلاثين.» (۱)

ترجمہ: ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہینہ ۲۹/دن کا ہوتا ہے، پس تم روزہ نہ رکھو، یہاں تک کہ تم چاند دیکھ لو اور روزہ نہ چھوڑو، یہاں تک کہ تم چاند دیکھ لو؛ پس اگر تم پر چاند پوشیدہ ہو جائے، تو تیس دن کا حساب کرلو۔

یہ حدیث مختلف الفاظ سے مروی ہے اور مطلب و مقصد سب کا تقریباً یکساں ہے، اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انتیسویں تاریخ کو اگر چاند کی رؤیت ہوگئی، تو روزہ وافطار (رمضان وعید) اسی کے مطابق کریں گے اور اگر چاند نظر نہ آیا، تو تیس دن مکمل کر کے اگلے دن سے ماہ کا حساب ہوگا؛ خواہ فلکیاتی حساب کی رو سے نیا چاند انتیسویں کو ہو یا نہ ہو، اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

اس حدیث میں خاص طور پر یہ بات غور کرنے کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۹/ تاریخ کو چاند مستور رہ جانے کی صورت میں تیس دن مکمل کرنے کا حکم دیا ہے اور ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ مستور چیز معدوم نہیں ہوتی؛ بل کہ فی الواقع موجود ہوتی ہے؛ البتہ اس پر کسی چیز کا پردہ پڑ جانے کی وجہ سے نظروں سے مستور ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ بتانا ہے کہ چاند افق پر موجود ہوتے ہوئے بھی، اگر تمہاری نظروں سے بوجہِ گرد و غبار یا بوجہِ بادل پوشیدہ رہ جائے، تو تیس دن کا مہینہ قرار دیا جائے اور یوں سمجھا

---

(۱) أبو داؤد: ۲۶۴/۷، الرقم: ۲۳۲۰

جائے کہ ۲۹/ کو شرعاً چاند نہیں ہوا۔

اس مفہوم کی مزید توضیح اس حدیث سے ہوتی ہے، جو حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

" لا تقدموا الشهر بصيام يوم ولا يومين إلا أن يكون شيء يصومهٗ أحدكم . ولا تصوموا حتى تروه ؛ ثم صوموا حتى تروه، فإن حال دونهٗ غمامة ، فأتموا العدة ثلاثين، ثم أفطروا والشهر تسع وعشرون". (۱)

ترجمہ: رمضان سے ایک دن یا دو دن پہلے روزہ نہ رکھو، الا یہ کہ کوئی ایسی بات ہو، جس میں تم میں سے کوئی ایک روزہ رکھتا ہو۔ روزہ نہ رکھو؛ جب تک چاند نہ دیکھو (پھر چاند دیکھنے کے بعد) روزہ رکھو؛ جب تک کہ پھر چاند دیکھو، پس اگر چاند پر بادل حائل ہو جائے تو تیس دن کی گنتی پوری کرلو۔

اس روایت میں ترمذی نے "**غيابة**" اور ابوداؤد نے "**غمامة**" اور نسائی نے "**سحاب**" روایت کیا ہے اور تینوں کا مطلب ایک ہے، وہ یہ کہ چاند کے اور ہمارے درمیان بادل یا اور کسی چیز کا پردہ حائل ہو جائے اور چاند نظر نہ آئے، تو تیس دن پورے کرو، اس سے صاف معلوم ہوا کہ مہینے کی آمد یا تو ۲۹/ تاریخ کو رؤیت پر ہوگی، یا اگر رویت نہ ہو، تو تیس دن کی تکمیل کے بعد ہوگی؛ لہٰذا کسی حسابی طریقے یا آلاتِ رصدیہ کی بنیاد پر مہینہ کی آمد تسلیم نہیں کی جائے گی۔

۲- جمہور علما کی دوسری دلیل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) أبوداود: ۲۶۵ ،الرقم، ۲۳۲۷۔الترمذي:۲/۶۷،الرقم: ۶۸۸سنن الكبرىٰ النسائي :۳/۱۰۳، الرقم:،۲۴۵۰

«" إنا أمّة أمّيّة لا نكتب و لا نحسب ، الشهر هٰكذا و هٰكذا ؛ يعني مرة تسعاً و عشرين و مرة ثلاثين "»(۱)

ترجمہ: ہم امی امّت ہیں، نہ لکھتے ہیں، نہ حساب کرتے ہیں، مہینہ کبھی اس طرح ہوتا ہے اور کبھی اس طرح (یہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلیوں سے اشارہ فرمایا) راوی فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد یہ تھی کہ مہینہ کبھی انتیس دن کا ہوتا ہے اور کبھی تیس دن کا۔

اس حدیث سے مفہوم ہوتا ہے کہ ماہ کے آغاز وانجام کا مدار، ان حسابات پر نہیں ہے؛ چناں چہ علامہ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

"حدیث کا ظاہر سیاق اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ (چاند کا) حکم حساب پر معلق نہیں ہے اور اس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" اگر تم پر چاند مستور ہو جائے، تو تیس دن پورے کرلو" اس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ اہلِ حساب سے پوچھو۔" (۲)

اور علامہ ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں کہ

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول وارشاد خبر ہے، جس میں نہی شامل و پوشیدہ ہے؛ کیوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی کہ وہ امت، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے والی

---

(۱) البخاري: ۱۲۵۴، الرقم: ۱۹۱۳۔ المسلم: ۵۴۵، الرقم: ۱۰۷۹۔ ۱/ ۴۷۔ السنن الكبرىٰ للنسائي: ۳/ ۱۰۷، الرقم: ۲۴۶۲۔ أبو داود: ۲۶۴، الرقم: ۲۳۱۹

(۲) فتح الباري: ۴/ ۱۶۳

ہے، وہ ''امتِ وسط'' (اعتدال والی امت ہے) جو امّی ہے، نہ لکھتی ہے، نہ حساب کرتی ہے۔ پس جو لکھتے اور حساب کرتے ہیں، وہ اس (خاص) حکم میں اس امت میں سے نہ ہوں گے''۔(۱)

غرض اس حدیث سے بھی واضح ہوا کہ ہلال کا مدار حساب پر نہیں ہے؛ بل کہ حساب پر مدار رکھنے سے منع کیا گیا ہے۔

چاند کو رؤیت پر معلق کرنے کی حکمت

اب رہی یہ بات کہ شرع نے چاند کو رؤیت پر کیوں معلق کیا اور حساب پر اس کا مدار کیوں نہ رکھا؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ شرع نے یہ حکم اور قانون بڑی حکمت و مصلحت کے پیشِ نظر بنایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ رؤیت ایک عام چیز ہے، جس میں ہر خاص و عام، جاہل و عالم، شہری و دیہاتی، برابر حصّہ لے سکتا اور اپنی عبادات کو اس کے مطابق سر انجام دے سکتا ہے، اس کے برخلاف ''حساب'' ہر کوئی نہیں جانتا اور نہ جان سکتا ہے، اگر اس پر چاند کا مدار رکھا جاتا، تو عبادات متعلقہ کی ادائے گی معدودے چند لوگوں کی رائے و فیصلے پر موقوف رہتی، جس میں سخت حرج اور انتہائی پریشانی ہے اور اسلام کا مزاج یہ نہیں کہ عوام کو تنگی و پریشانی میں ڈالے؛ بل کہ وہ سہولت و آسانی فراہم کرنا چاہتا ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ چاند کا حساب آج تک بھی منضبط نہیں اور اس کا کوئی اصول و قاعدہ دریافت نہیں ہو سکا ہے اور اہلِ حساب نے قدیم زمانے سے اس کا اعتراف کیا ہے کہ رؤیتِ ہلال کس دن ہوگی، اس کا قطعی فیصلہ کرنے کے لیے کوئی

---

(۱) فتاویٰ ابن تیمیة: ۲۵/۱۶۵

اصول اور ضابطہ دریافت میں نہیں آیا؛ جب اس کا کوئی ضابطہ ہی دریافت نہیں ہوا، تو اس بحث کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حساب پر رؤیتِ ہلال کو معلق کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

رؤیتِ ہلال کے لیے کوئی فلکیاتی حساب منضبط نہیں

چناں چہ قدیم وجدید دونوں تحقیقات اس پر متفق ہیں کہ رؤیتِ ہلال کے لیے کوئی فلکیاتی حساب وقاعدہ منضبط نہیں ہوسکتا۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس پر بہت تفصیل کے ساتھ مدلل کلام کیا ہے، وہ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ

"اعلم أن المحققين من أهل الحساب كلهم متفقون علىٰ أنهٗ لا يمكن ضبط الرؤية بحساب بحيث يحكم بأنهٗ يرى لا محالة ، أو لا يرى البتة على وجه مطرد، وإنما قد يتفق ذٰلک أو لا يمكن بعض الأوقات ؛ و لهذا كان المعتنون بهذا الفن من الأمم : الروم والهند والفرس والعرب و غيرهم مثل بطليموس الذي هو مقدم هٰولاء و من بعدهم قبل الإسلام وبعده لم ينسبوا إليه في الرؤية حرفاً واحداً". (۱)

ترجمہ: "جان لو کہ اہلِ حساب میں سے تمام کے تمام محققین اس بات پر متفق ہیں کہ رؤیتِ ہلال کو کسی حساب سے منضبط کرنا ممکن نہیں کہ یہ حکم لگایا جاسکے کہ وہ یقیناً دکھائی دے گا یا دکھائی نہ دے گا؛ بل کہ رؤیت کبھی اتفاقاً ہوجاتی ہے اور بعض اوقات ممکن نہیں ہوتی

(۱) فتاویٰ ابن تیمیة: ۱۸۳/۲۵

اور یہی وجہ ہے کہ روم، ہندوستان، فارس اور عرب وغیرہ اقوام میں
سے جو لوگ اس فن (فلکیات) سے دل چسپی واعتنا کرنے والے تھے
جیسے: بطلیموس، جو کہ ان لوگوں میں مقدم ہے اور جو ان کے بعد
گزرے ہیں؛ خواہ اسلام سے قبل یا اسلام کے بعد، ان کی طرف
رؤیت کے بارے میں ایک حرف بھی منسوب نہیں کیا گیا ہے"۔

علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ نے تمام محققین اہلِ حساب سے یہ نقل فرمایا کہ
"رؤیتِ ہلال کے بارے میں کوئی حساب اور ضابطہ منضبط کرنا خارج از امکان ہے" اور لیجیے چوتھی صدی ہجری کے نامور فلاسفر اور ماہرِ نجوم وفلکیات "ابوالریحان البیرونی" نے اپنی کتاب "الآثار الباقیۃ" میں تمام علمائے فلکیات کا اجماعی نظریہ یہی بتایا ہے کہ

فضائی وفلکیاتی حالات ایسے ہیں کہ جو کوئی غور کرے گا، تو رؤیتِ
ہلال کے ہونے یا نہ ہونے کا کوئی قطعی فیصلہ ہرگز نہ کر سکے گا۔ (۱)

نیز حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے "رؤیتِ ہلال" میں لکھا ہے کہ

"کشف الظنون" میں بہ حوالہ شمس الدین، محمد بن علی خواجہ
کا چالیس سال کا تجربہ یہی لکھا ہے کہ ان معاملات میں کوئی صحیح
اور یقینی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی، جس پر اعتماد کیا جاسکے"۔ (۲)

یہ بیانات اگرچہ بہت پرانے ہیں؛ مگر صورتِ حال آج کے اس ترقی یافتہ دور میں بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے؛ بل کہ جدید فلکیاتی علوم کے ماہرین بھی اس بات کا اعادہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

---

(۱) الآثار الباقیۃ، ۱۹۸، بہ حوالہ رؤیتِ ہلال: ۲۵
(۲) رؤیتِ ہلال: ۴۸

چناں چہ ایک پاکستانی مصنف ''جناب ضیاء الدین صاحب'' نے اپنے رسالے ''رؤیتِ ہلال موجودہ دور میں'' میں یہ لکھا ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں یونیورسٹی آف لندن آبزرویٹری اور رائل گرین وِچ آبزرویٹری سے استفسار کیا، اس کے جواب میں ان کو یونیورسٹی آف لندن آبزرویٹری کے شعبہ فزکس وعلومِ فلکیات کے اسٹنٹ ڈائرکٹر نے جو اپنی ماہرانہ رائے اور فیصلہ دیا، وہ یہ تھا:

''آپ کے استفسار کے متعلق کہ آیا رصد گاہی سائنس داں کوئی ایسا معیار قائم کرنے کے قابل ہو چکے ہیں، جس سے نیا چاند نمودار ہونے والی شام کی یقینی پیش گوئی کی جاسکے؟

مجھے افسوس ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہے، کچھ عرصہ قبل اس خاص مسئلے پر قضاۃ، سعودی عرب کے اراکین کے ساتھ میرے طویل مذاکرات ہوئے اور یہ معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں پیش کی جانے والی کوئی بھی تجویز یقینی طور پر قرآنِ مجید کی ضروری شرائط سے تقریباً متصادم ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ درحقیقت رؤیتِ ہلال کے متعلق کوئی بھی مفروضہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ آخر میں لکھا ہے کہ مجھے اس بات پر افسوس ہے کہ میرے خیال میں کوئی ایسا سائنسی طریقہ نہیں ہے، جس سے کہ اس موقع پر اسلام کی ضروری شرائط پوری کی جاسکیں''۔ (۱)

جناب ضیاء الدین صاحب نے آگے چل کر رصد گاہ گرین وچ کی سائنس ریسرچ کونسل کے فلکیاتی معلوماتی قرطاس نمبر ۶/ کے حوالے سے نقل کیا ہے:

''ہر ماہ نئے چاند کے پہلی مرتبہ نظر آنے والی تاریخوں کے متعلق پیش گوئی کرنا ممکن نہیں؛ کیوں کہ ایسے کوئی قابلِ اعتماد اور مکمل طور پر

---

(۱) رؤیتِ ہلال موجودہ دور میں: ۱۵

مستند مشاہدات موجود نہیں ہوتے، جنہیں ان شرائط کو متعین کرنے میں استعمال کیا جا سکے، جو چاند کے اول بار نظر آنے کے لیے کافی ہو۔(۱)

ان جدید ماہرینِ فلکیات کے بیانات کا حاصل بھی وہی نکلا کہ ''رؤیتِ ہلال کی یقینی پیش گوئی کے لیے کوئی حساب واصول اور سائنسی طریقہ نہیں ہے''، یہ بیانات بالکل تازہ اور ''اپٹوڈیٹ'' (Up to date) ہیں اور ان سے ان لوگوں کے خیال کا بطلان ظاہر ہو گیا، جو کہتے ہیں کہ اس دورِ ترقی میں فلکیاتی علوم کی ترقی سے یہ بات ممکن ہو گئی کہ رؤیتِ ہلال کو حساب کے ذریعے معلوم کر لیا جائے، ابھی ہم نے قدیم اہلِ حساب کے ساتھ جدید ماہرینِ فلکیات کے بیانات ملاحظہ کیے، جو سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ رؤیتِ ہلال کے لیے کوئی حساب منضبط نہیں ہے اور نہ ممکن ہے۔

امکانِ رؤیت سے رؤیت ثابت نہیں ہوتی

غرض یہ کہ آج تک کسی ماہرِ فلکیات نے اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ فلاں مہینے کا چاند فلاں سال میں فلاں تاریخ کو نظر آئے گا؛ البتہ ان لوگوں نے امکانِ رؤیت کا دعویٰ کیا ہے اور یہ بات معمولی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ رؤیت کے وقوع اور رؤیت کے امکان میں بڑا فرق ہے؛ ماہرینِ فلکیات صرف اتنا بتاتے ہیں کہ فلاں مہینے کی فلاں تاریخ و دن میں رؤیتِ ہلال کا امکان ہے؛ مگر وہ یہ حتمی و قطعی فیصلہ نہیں دیتے اور نہ دے سکتے ہیں کہ فلاں تاریخ و دن میں رؤیت واقع ہو جائے گی، اسلام نے مدارِ صوم وافطار؛ وقوعِ رؤیت کو قرار دیا ہے، نہ کہ محض امکانِ رؤیت کو۔

چناں چہ اوپر اس کی وضاحت کر چکا ہوں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نبی

---

(۱) رؤیتِ ہلال موجودہ دور میں: ۱۷

کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۲۹/ تاریخ کو چاند مستور رہ جانے کی صورت میں حکم دیا ہے کہ تیس دن پورے کرلو، اس میں چاند کو معدوم نہیں مانا گیا ہے؛ بل کہ مستور کہا گیا ہے۔ جس کا مطلب یہ نکلا کہ چاند اپنے افق پر موجود ہونے کے باوجود کسی عارض کی وجہ سے نظر نہ آئے، تو بھی شرعی حکم یہ ہے کہ تیس دن پورے کرو۔

غور کیجیے! کیا اس صورت میں (جب کہ چاند مستور ہے)، رؤیت کا امکان نہیں ہے؟ بلا شبہ ہے ، اگر نظر نہیں آرہا ہے، تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے امکانِ رؤیت کے باوجود، تیس دن پورے کرنے کا حکم دیا ہے؛ لہٰذا معلوم ہوا کہ محض رؤیت کا امکان ثبوتِ رؤیت کے لیے کافی نہیں۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے قبلے کی تعیین کے لیے فلکیاتی تحقیقات کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کی بحث کے ضمن میں اس مسئلے پر بھی کلام کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

ما صرَّح بہٖ علماءُ نا من عدم الاعتماد علیٰ قول أھل النجوم في دخول رمضان ؛ لأن ذالک مبني علی أنّ وجوب الصوم معلق برؤیة الھلال لحدیث ”صوموا لرؤیتہٖ“ و تولید الھلال لیس مبنیاً علی الرؤیة ، بل علیٰ قواعد فلکیة، وھي و إن کانت صحیحة في نفسھا ؛لکن إذا کانت و لا دته في لیلة کذا فقد یریٰ فیھا الھلال و قد لا یریٰ ، و الشارع علق الوجوب علی الرؤیة لا علی الولادة . (١)

یعنی ہمارے علمانے جو رمضان کی آمد کے بارے میں اہلِ نجوم کے قول پر اعتماد نہ ہونے کی تصریح کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ

---

(١) رد المحتار: ٣/ ٣٥٥

روزے کا وجوب رؤیتِ ہلال پر معلق ہے، اس حدیث کی رو سے کہ ''صوموا لرؤیتہ'' کہ چاند دیکھ کر روزے رکھو اور چاند کی ولادت رؤیت پر مبنی نہیں ہے؛ بل کہ فلکیاتی قواعد پر مبنی ہے اور یہ قواعد اپنی جگہ اگرچہ صحیح ہیں؛ لیکن اگر کسی رات میں چاند کی ولادت ہو، تو کبھی وہ نظر آتا ہے اور کبھی نظر نہیں آتا اور شارع نے روزے کے وجوب کو رؤیت پر معلق کیا ہے، نہ کہ چاند کی ولادت پر۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کی اس عبارت سے یہ واضح ہوا کہ تولیدِ ہلال الگ چیز ہے اور رؤیتِ ہلال الگ چیز ہے، تولیدِ ہلال، جس کو (NEW MOON) کہا جاتا ہے، اس سے صرف رؤیت کا امکان پایا جاتا ہے، نہ کہ رؤیت کا وقوع اور شریعت نے محض تولید ہلال یا امکانِ رؤیت پر مدارِ کار نہیں رکھا ہے؛ بل کہ وقوعِ رؤیت پر مدار ہے۔

رؤیت پر اثر انداز ہونے والے عوامل

وجہ یہ ہے کہ امکانِ رؤیت کے باوجود، بعض عوامل کی بنا پر رؤیت واقع نہیں ہوتی، علمائے فلکیات نے مسلسل تجربے اور مشاہدے کی بنا پر بیان کیا ہے کہ چاند جب ۲۹/ دن، ۲۱/ گھنٹے، ۴۴/ منٹ اور ۳/ سکنڈ میں اپنی گردش پوری کر کے سورج سے جا ملتا ہے، تو اس وقت اس کا دکھائی دینا ممکن نہیں؛ بل کہ اس کے بعد بھی تقریباً ۱۹/ یا ۲۰/ گھنٹے تک اس کا نظر آنا خارج از امکان ہوتا ہے، اس کے بعد اس کے نظر آنے کے امکانات شروع ہوتے ہیں اور عام طور پر ۲۱/ یا ۲۲/ گھنٹوں بعد ہی وہ قابلِ رؤیت ہوتا ہے؛ مگر اس وقت یہ محض امکان ہے، ہوسکتا ہے کہ یہ نظر آئے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ نظر نہ آئے؛ کیوں کہ رؤیت پر بعض عوامل اثر انداز ہوتے ہیں:

مثلاً مطلع کی کیفیت، فضا میں گرد وغبار، مقامِ مشاہدے کا محلِ وقوع، اسی طرح گرمی، سردی، فضا کی نمی، فضا کی خشکی؛ یہ سب باتیں رؤیت پر اثر انداز ہوتی ہیں؛ لہٰذا محض امکانِ رؤیت پر مدار نہیں رکھا گیا؛ بل کہ رؤیتِ حقیقی و واقعی پر مدار رکھا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فلکیاتی علوم کی بنیاد پر رؤیت کا مسئلہ حل نہیں کیا جا سکتا اور جن حضرات نے ان کی ترقی کی طرف نظر کر کے یہ سمجھا ہے کہ اس مسئلے کو ان علوم سے حل کیا جا سکتا ہے، یہ ان کی غلطی ہے اور خود اس فن کے ماہرین نے اقرار کیا ہے کہ اب تک کوئی قابلِ وثوق ایسا طریقہ ایجاد نہیں ہوا ہے کہ جس سے شرعی رؤیت کی شرائط پوری ہوسکیں۔ فلکیاتی تحقیقات نے اب تک صرف مخصوص تاریخوں میں رؤیتِ ہلال کے امکان کو ظاہر کر دیا ہے؛ مگر چوں کہ صرف امکان سے شرعی رؤیت کا تحقق نہیں ہوتا، جس پر احکام کا مدار ہے؛ اس لیے اس کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جا سکتا اور اس پر احکامِ صوم وافطار کا مدار نہیں رکھا جا سکتا۔

ہوائی جہاز سے رؤیتِ ہلال

ہوائی جہاز سے اڑ کر اگر چاند دیکھا جائے، تو یہ قابلِ اعتبار ہوگا یا نہیں اور ہوگا تو کس صورت میں ہوگا؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ

ہوائی جہاز سے اڑ کر دیکھا ہوا چاند اس وقت قابلِ اعتبار ہوگا، جب کہ جہاز کی پرواز اتنی بلند نہ ہو کہ سطحِ زمین کے افق اور اس بلندی کے افق میں فرق ہو جائے، اگر اتنی بلندی پر جہاز سے پرواز کیا کہ سطحِ زمین اور اس بلندی کے افق میں کوئی فرق نہیں ہے، تو اس چاند کا اعتبار کیا جائے گا، اس کی نظیر، فقہ کا یہ جزئیہ ہے:

فأما إذ كانت متغيمة أو جاء من خارج المصر أو كان في موضع مرتفع فإنهٗ يقبل عندنا.(۱)

ترجمہ: جب آسمان ابر آلود ہو یا چاند دیکھنے والا شہر کے باہر سے آیا ہو یا کسی اونچی جگہ میں ہو، تو اس کا قول ہمارے نزدیک مقبول ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بلند جگہ سے چاند دیکھ کر خبر دے، تو اس کا قول قابلِ اعتبار ہوگا اور اس کی وجہ بہ قولِ فقہا یہ ہے کہ بعض اوقات چاند بلندی سے دیکھا جا سکتا ہے، جب کہ نیچے سے وہ نظر نہیں آتا۔(۲)

اس سے ہوائی جہاز سے دیکھے ہوئے چاند کا معتبر ہونا معلوم ہوا؛ لیکن جیسا کہ اوپر بھی اشارہ کیا گیا ہے، جہاز کی پرواز اگر بہت زیادہ بلند ہو جائے کہ وہاں تک زمین والوں کی نظریں پہنچ ہی نہ سکیں، تو اس چاند کا اعتبار نہ ہوگا۔

وجہ اس کی وہ ہے، جو حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بیان کی ہے کہ

شرعاً رؤیت وہی معتبر ہے، کہ زمین پر رہنے والے اپنی آنکھوں سے اس کو دیکھ سکیں۔(۳)

---

(۱) رد المحتار:۳/۳۵۷

(۲) نقل الشامي رحمه الله: " وجه ظاهر الرواية أن الرؤية تختلف باختلاف صفو الهواء وكدرته وباختلاف انهباط المكان وارتفاعه، فإن هواء الصحراء أصفىٰ من هواء المصر، وقد يرى الهلال أعلى المكان ما لا يرى من الأسفل، فلا يكون تفرده بالرؤية خلاف الظاهر بل على موافقة الظاهر ". (رد المحتار:۳/۳۵۷)

وذكر الطحاوي: أنهٗ تقبل شهادة الواحد إذا جاء من خارج المصر وكذا إذا كان علىٰ مكان مرتفع. (الفتاوى الهندية:۱/۲۱۸)

(۳) آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام:۱۸۶

نیز "مجلسِ تحقیقاتِ شرعیہ" لکھنؤ کے اجلاس، منعقدہ ۳/۴/مئی ۱۹۶۷ء کی تجویز میں بھی یہی کہا گیا ہے۔ (رؤیتِ ہلال: مولانا محمد میاں صاحب:۱۰۳)

اسی بات کواور زیادہ وضاحت سے حضرت مفتی رحمہ اللہ صاحب نے اپنے فتاویٰ میں بیان کیا ہے کہ

"ہوائی جہاز کے ذریعے رؤیتِ ہلال کی صورت میں بہت ممکن ہے کہ ہوائی جہاز اتنی بلندی پر پہنچ گیا ہو، جہاں مطلع بدل جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ دوسرے مطالع کا چاند تو مغربی جانب میں پرواز کر کے اٹھائیس ۲۸/ تاریخ کو بھی دیکھا جا سکتا ہے،ایسی صورت میں مشہور اختلافی مسئلہ (اختلافِ مطالع معتبر ہے یا نہیں) سامنے آئے گا؛ لیکن محققینِ حنفیہ کا فتویٰ یہ ہے کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار کرنا چاہیے، -بناءً علیہ- جو شہادت بہ بذریعے ہوائی جہاز، بلادِ بعیدہ سے یا اتنی بلندی سے آئے، جہاں اختلافِ مطالع ہو سکتا ہے؛ وہ شہادت اس جگہ کے لیے قابلِ قبول نہیں۔"(۱)

الغرض! بہت زیادہ بلندی کی رؤیت معتبر نہیں ہوگی، جس صورت میں ہوائی جہاز کی رؤیت معتبر ہے، اس میں رمضان مبارک کا چاند ہو اور مطلع ابر آلود ہو، تو ایک معتبر، ثقہ یا مستور الحال آدمی کی خبر کافی ہے؛ کیوں کہ مطلع کے ابر آلود ہونے کی صورت میں، رمضان کے چاند کے لیے ایک ثقہ و عادل آدمی کی خبر معتبر ہوتی ہے۔(۲)

اسی طرح صحیح قول کے مطابق اس شخص کی خبر بھی یہاں معتبر ہے، جس کا فسق

---

(۱) امداد المفتیین: ۴۸۲

(۲) إن كان بالسماء علة ، فشهادة الواحد على هلال رمضان مقبولة ؛ إذا كان عدلاً مسلماً عاقلاً بالغاً حراً كان أو عبداً ذكراً كان أو أنثىٰ.

(الفتاوى الهندية: ۱/ ۲۱۷- مراقي الفلاح: ۲۳۵-۲۳۶)

ظاہر نہ ہو اور وہ مستور الحال ہو۔[۱]

چوں کہ مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں عید کے چاند کے لیے دو ثقہ مردوں کی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ضروری ہے، جیسا کہ کتبِ فقہ میں مصرح ہے۔[۲]

لہٰذا ہوائی جہاز کی رؤیت میں بھی یہی حکم ہوگا کہ مطلع اگر صاف نہ تھا اور عید کا چاند ہے، تو دو شخصوں کی گواہی ضروری ہے یا ایک مرد اور دو عورتوں کی۔

مطلع اگر صاف ہو، ابر آلود و غبار آلود نہ ہو، تو ہوائی جہاز کی خبر معتبر نہیں، نہ رمضان کے چاند کے لیے اور نہ عید کے چاند کے لیے؛ کیوں کہ مطلع کے صاف ہونے کی صورت میں حضراتِ فقہا نے رمضان و عید، دونوں کے چاند کے لیے ایک جمِ غفیر کا دیکھنا اور اطلاع دینا ضروری قرار دیا ہے۔[۳]

---

(۱) وأما مستورالحال فالظاهر أنه لا تقبل شهادتهٗ . وروى الحسنُ عن أبي حنيفة رَحِمَهُ اللهُ أنه تقبل شهادته ، وهو الصحيح ، كذا في المحيط.
(الفتاویٰ الهندية :۱/ ۲۱۷)

وفي الدر: [للصوم مع علة كغيم] وغبار [خبر عدل] أو مستور على ماصححه البزازي. (الدر المختار مع الشامي : ۳/۳۵۲، مراقي الفلاح:۲۳۶)

(۲) ويلتمس هلال شوال في تاسع وعشرين من رمضان، وإن كان بالسماء علة لا تقبل إلا شهادة رجلين أو رجل وامرأتين . (الفتاوى الهندية:۱/ ۲۱۸)

[وشرط للفطر،مع العلة]أي من غيم وغبار ودخان [نصاب الشهادة] هو رجلان أو رجل و امرأتان.

(الدرالمختار مع الشامي :۳/۳۵۳-شرح الوقاية :۷۵،الجوهر ة النيرة:۱/۲۱۱-البحر الرائق : ۲/۲۶۶)

(۳) مصدرِ سابق

اور جمِ غفیر کی تعریف میں علامہ صدر الشریعہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے بیان کیا ہے کہ

وہ ایسا بڑا مجمع ہے کہ اس کی خبر سے علمِ یقینی حاصل ہو جائے اور ان سب کا جھوٹ پر اتفاق، عقل تسلیم نہ کرے۔ (۱)

اور درمختار میں لکھا ہے کہ

''ظنِ غالب'' اس مجمع کی خبر سے حاصل ہو جائے''۔ (۲)

اور یہی صحیح قول ہے، اس سے اتنی بات معلوم ہوگئی کہ مطلع کے صاف ہونے کی حالت میں ایسی خبر درکار ہے، جس سے یقین نہ سہی، کم از کم غالب گمان اس بات کا حاصل ہو جائے کہ ''چاند ہو گیا''، اس میں ایسا شک وتردد نہ رہے کہ ظنِ غالب کے خلاف ہو، اب ہوائی جہاز کی زیرِ بحث رؤیت کو دیکھیے کہ کیا اس سے ظنِ غالب چاند کا حاصل ہو جاتا ہے یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ مطلع صاف ہونے کی صورت میں نیچے والوں کا چاند کو نہ دیکھ سکنا اور ہوائی جہاز سے اس کا دیکھ لینا؛ اس رؤیت میں ایک احتمال تو یہ پیدا کرتا ہے کہ دیکھنے والوں نے کسی اور چمکتے ہوئے ستارے کو دیکھ لیا ہو، ورنہ نیچے والوں کو مطلع صاف ہونے کے باوجود کیوں نظر نہ آیا؟ اور دوسرا احتمال یہ پیدا کر دیتا ہے کہ جہاز کی پرواز اتنی بلند ہوگئی ہوگی کہ سطحِ زمین کا افق بدل گیا؛ اس لیے نیچے سے دیکھنے والوں کو نظر نہ آیا۔

ان احتمالات کے ساتھ ظنِ غالب حاصل نہیں ہوسکتا؛ اس لیے اگرچہ متعدد لوگوں نے ہوائی جہاز سے چاند دیکھا ہو، اس کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے؛ کیوں کہ

---

(۱) شرح الوقایة:۷۵

(۲) [یقع العلم] الشرعي وهو غلبة الظن بخبرهم .(الدر المختار مع الشامي:۳/۳۵٦)
وإن لم يكن بالسماء علة فيهما ، يشترط أن يكون فيهما الشهود جمعاً كثيراً يقع العلم بخبرهم ؛ أي غالب الظن لا اليقين. (البحر الرائق:۲/۴٦۸)

فقہانے ''جمِ غفیر'' کی شرط اس لیے لگائی تھی کہ چاند ہوجانے کا ظنِ غالب حاصل ہوجائے؛ جب یہاں یہ حاصل نہ ہوا، تو ''جمِ غفیر'' کا بھی اعتبار نہیں کیا جاسکتا، اسی کو بعض علما نے اختیار فرمایا ہے۔

راقم کہتا ہے کہ اگر کسی طرح ان احتمالات کو ختم کیا جاسکتا ہو اور ظنِ غالب حاصل ہوجائے، تو پھر ہوائی جہاز کی عام رؤیت یا متعدد ہوائی جہازوں کی رؤیت کو معتبر قرار دینا چاہیے؛ جب کہ علامہ شامی رحمہ اللہ مطلع صاف ہونے کی صورت پر ایک شخص کی خبر کو بھی اس وقت کافی قرار دیتے ہیں، جب کہ وہ کسی بلند جگہ پر ہو اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ

'' أن الرؤية تختلف باختلاف صفوالهواء وكدرته وباختلاف انهباط المكان وارتفاعه، فإن هواء الصحراء أصفىٰ من هواء المصر، وقد يرى الهلال أعلى الأماكن ما لا يرى من الأسفل ''. (١)

ترجمہ: ہوا کی صفائی اور کدورت کے اختلاف سے اور جگہ کے پست و بلند ہونے کے لحاظ سے دیکھنے میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور جنگل کی ہوا شہر کی ہوا سے زیادہ صاف ہوتی ہے اور چاند کبھی بلند جگہوں سے نظر آجاتا ہے، جب کہ نیچے سے نظر نہیں آتا۔

اس اصول پر اگر ہوائی جہاز کے مسئلے کو قیاس کرکے کہا جائے کہ مطلع کے صاف ہونے کی صورت پر بھی اس کی رؤیت معتبر ہے، تو درست ہوگا؛ مگر پہلے یہ احتمالات اچھی تدبیر سے ختم کرلیے جائیں۔ واللہ أعلم۔

---

(١) رد المحتار: ٣/٣٥٧

خورد بین و دور بین سے رؤیتِ ہلال

خورد بین و دور بین سے رؤیتِ ہلال کے تقریباً وہی احکام ہیں، جو اوپر جہاز سے رؤیت کے متعلق مذکور ہوئے، کہ ان سے رؤیت معتبر ہے اور رمضان کے چاند کے لیے مطلع ابر آلود ہونے کی صورت پر، ایک معتبر یا مستور الحال کی خبر کافی ہے اور عید کے چاند کے لیے مطلع ابر آلود ہونے کی حالت میں، دو معتبر مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی محض خبر نہیں؛ بل کہ شہادت و گواہی ضروری ہے اور مطلع صاف ہو، تو اس سے دیکھے ہوئے چاند کا اعتبار اس وقت ہوگا؛ جب کہ جمِ غفیر نے چاند دیکھا ہو اور چاند ہو جانے کا ظنِ غالب حاصل ہو جائے، ورنہ اگر یہ احتمال ہو کہ خورد بین یا دور بین سے کوئی اور سیارہ نظر آ گیا ہوگا؛ تو اس احتمال کے ساتھ مطلع صاف ہونے کی صورت پر اس کا اعتبار نہ ہوگا، نہ عید میں نہ رمضان میں۔ اسی طرح دور بین ایسی نہ ہو، جس سے افق پر نہ آیا ہوا چاند بھی نظر آ جاتا ہو، چناں چہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ اپنے ایک فارسی میں تحریر کردہ فتوے میں فرماتے ہیں:

> ”اگر بدلائلِ این فن، امر بہ ثبوت پیوندد کہ خاصیت آں دور بین چنیں است کہ ہلال باوجود تحتِ افق بودن بواسطہ آن بنظر می آید؛ حتی کہ شمس ہم باوجود عدم طلوع از افق دراں طالع می نماید؛ آرے صحیح و معتبر نباشد“۔(۱)

> ترجمہ: اگر فنی دلائل سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے کہ اس دور بین کی خاصیت یہ ہے کہ چاند افق کے نیچے ہونے کے باوجود، اس کے ذریعے نظر آ جاتا ہے؛ حتی کہ سورج بھی افق سے

(۱) امداد الفتاویٰ: ۱۰۹/۲

طلوع نہ ہونے کے باوجود، اس میں طلوع ہونے والا نظر آتا ہے، تو اس سے رؤیت صحیح ومعتبر نہ ہوگی۔

اگر ایسی دوربین ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ کسی صورت پر بھی، اس سے رؤیت کا اعتبار نہ ہوگا، جیسا کہ حضرت نے لکھا ہے۔

ٹی وی (T.V) اور ریڈیو (Radio) سے رؤیت کی خبر

اگر ''ریڈیو'' اور ''ٹی - وی'' سے رؤیتِ ہلال کی خبر معلوم ہو، تو اس کے معتبر ہونے نہ ہونے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل تفصیل ملحوظ ہونا چاہیے:

ریڈیو اور ٹی - وی کی خبر اس وقت معتبر ہوگی؛ جب کہ خبر دہندہ ثقہ و عادل یا مستور الحال ہو اور اس ریڈیو اسٹیشن کے بارے میں معلوم ہو کہ یہ علما کے فیصلے کے بغیر کوئی خبر ہلال کے بارے میں شائع نہیں کرتا۔

چناں چہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''(خبر و اطلاع) اگر کسی ریڈیو میں علما کے فیصلے کے مطابق ثقہ لوگوں کے انتظام سے نشر کی جائے، جس میں مغالطہ اور بے احتیاطی کا خطرہ نہ ہو، دوسرے شہروں میں جہاں خبر سنی جائے، اس کا قبول کر لینا اور اس خبرِ ثقہ کی بنا پر اپنی بستی میں روزے کا اعلان کر دینا جائز ہے؛ لیکن اس پر عمل سے پہلے یہ تحقیق ضروری ہے کہ جن نشر گاہوں سے یہ خبر نشر ہوئی ہے، وہاں اس کا معقول انتظام ہے کہ بدون علما کے فیصلے کے کوئی خبر ہلال کے متعلق نشر نہیں کی جاتی؟ اور جب تک اس کی تحقیق نہ ہو، اس کا قبول کرنا درست نہیں۔''(۱)

---

(۱) امداد المفتین: ۴۷۷

اس میں صرف ریڈیو کا ذکر ہے؛ لیکن چوں کہ ٹی-وی اور ریڈیو میں خبر کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں؛ اس لیے ٹی-وی کے بارے میں بھی یہی شرط معتبر ہوگی۔

مذکورہ بالا شرائط کے مطابق اگر کسی ریڈیو یا ٹی-وی سے ہلال کی خبر آئے، تو وہ رمضان کے ثبوت کے لیے معتبر مانی جائے گی، مفتی صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں:

> ''صحیح اور معمول بھی یہی ہے کہ ہلالِ رمضان کی خبر میں چوں کہ شہادت شرط نہیں؛ اس لیے جس جگہ خبر دینے والے کی آواز جائے اور اس کا ثقہ ہونا معلوم ہو، تو دوسرے شہروں میں اس پر عمل کرنا جائز ہے۔''(۱)

مگر یہاں وہ قاعدۂ فقہیہ یاد رکھنا چاہیے کہ مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں رمضان کے لیے ایک ثقہ یا مستور الحال کی خبر کافی ہے؛ لہٰذا مطلع صاف نہ ہونے کی صورت میں ٹی-وی و ریڈیو سے ایک کی رؤیت کی خبر آئے، تو کافی ہے؛ لیکن مطلع صاف ہو، تو متعدد اشخاص کی خبر ضروری ہے؛ لہٰذا اگر ریڈیو سے اعلان میں یہ کہا گیا ہو کہ ایک جمِ غفیر نے فلاں مقام پر چاند دیکھا ہے، تو وہ معتبر ہے، ورنہ نہیں۔

رمضان کے علاوہ دوسرے مہینوں کے چاند کے لیے شہادت کا ہونا ضروری ہے؛ اس لیے عیدین کے چاند کی خبر بہ ذریعے ٹی-وی اور ریڈیو کے معتبر نہ ہوگی؛ کیوں کہ شہادت اس کو کہتے ہیں کہ شہادت دینے والا رو بہ رو حاضر ہو کر گواہی دے۔(۲)

---

(۱) امداد المفتین: ۴۸۳

(۲) قال الشيخي زاده : وفي العناية : وفي اصطلاح أهل الفقه عبارة عن إخبار صادق في مجلس الحاكم بلفظة " الشهادة ". (مجمع الانهر: ۲۵۸/۳)

اور ریڈیو اور ٹی-وی میں یہ بات حاصل نہیں ہوتی، حضرت مفتی صاحبؒ لکھتے ہیں:

”ہلالِ رمضان کے علاوہ ہلالِ عیدین اور دوسرے اہلّہ (ہلال کی جمع) کے معاملے میں باتفاقِ فقہا، شہادت شرط ہے اور شہادت کی شرائط میں سے سب سے بڑی شرط ”شہودِ شاہد“، یعنی عدالت کے سامنے گواہ کا حاضر ہونا ہے، جو ریڈیو کی خبر میں مفقود ہے؛ لہٰذا ریڈیو کی خبر پر عید یا افطار کرنا درست نہیں ہوسکتا؛ اگر چہ خبر دینے والے کتنے ہی ثقہ اور عالم کیوں نہ ہوں۔“(۱)

کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ ٹی-وی میں رو بہ رو حاضر ہو کر گواہی ہوسکتی ہے؛ کیوں کہ عرفِ عام میں بھی اور شرعی اصطلاح میں بھی، اس حاضری کا نام شہادت نہیں ہے؛ اسی لیے اگر کوئی شخص اپنا بیان ویڈیو کیسٹ (Video Cassette) میں بھر کر عدالت میں بھیج دے، تو اس کا نام شہادت نہ ہوگا؛ حالاں کہ وہاں بھی اس کی تصویر ہوتی ہے؛ مگر اس کی بنیاد پر کسی بھی عدالت گاہ میں فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔

البتہ اگر کسی جگہ باقاعدہ شہادت کی بنیاد پر علما یا ہلال کمیٹی نے عید کا فیصلہ کر دیا ہو اور اس فیصلے کا اعلان ریڈیو یا ٹی-وی پر ہو جائے، تو جس شہر کے قاضی یا ہلال کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا ہے، اس شہر اور اس کے آس پاس کے مضافات و دیہات کے لوگوں کو اس اعلان پر عید کرنا بھی درست ہے؛ کیوں کہ یہ شہادت نہیں؛ بل کہ شہادت کے بعد علما نے جو فیصلہ کیا ہے، اس کا اعلان ہے اور اس کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ معتبر و ثقہ لوگ پوری احتیاط کے ساتھ اعلان کریں۔(۲)

---

(۱) امداد المفتین: ۴۸۴

(۲) تفصیل کے لیے دیکھو: جواہر الفقہ: ۱/۴۰۲، ۴۰۳؛ آلاتِ جدید کے شرعی احکام: ۱۸۹، رؤیتِ ہلال از مولانا میاں صاحبؒ: ۱۰۰

پھر علما کا یہ فیصلہ چوں کہ وہیں تک نافذ ہوتا ہے، جہاں تک ان کو ولایت حاصل ہو؛ اس لیے جس جگہ کے علما یا ہلال کمیٹی نے عید کا فیصلہ کیا ہے، یہ فیصلہ انہی حدود تک نافذ ہوگا؛ جہاں تک ان کو ولایت حاصل ہے، ان حدود کے باہر کے لوگوں کے لیے یہ فیصلہ نافذ نہ ہوگا؛ چناں چہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں:

”کراچی ریڈیو کی نشر کردہ خبر پر اہلِ کراچی و متعلقات عید کر سکتے ہیں، بہ شرطے کہ ریڈیو نے علما کا فیصلہ نقل کر کے اعلان کیا ہو، دوسرے شہروں میں اس کی خبر پر عید منانے اور افطار کرنے کی پھر بھی کوئی وجہ نہیں۔“ (۱)

ہاں! البتہ پورے ملک پر حاوی، ولایت کے مالک قاضی یا کمیٹی کا فیصلہ ریڈیو یا ٹی-وی پر نشر کیا جائے، تو اس پر پورے ملک کو بھی عید منانا درست ہے۔ (۲)

ایک جگہ کی ریڈیائی خبر یا ٹی-وی کی اطلاع بہ ہر صورت اسی وقت معتبر ہوگی؛ جب کہ اس جگہ کا مطلع، جہاں کہ چاند کی خبر ریڈیو یا ٹی-وی سے معلوم ہوئی ہے اور اس جگہ کا مطلع جہاں خبر سنی جا رہی ہے، دونوں ایک ہو، اگر مطلع بدل گیا ہو، تو پھر محققین کی رائے کے مطابق اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ (۳)

اگر ریڈیو یا ٹی-وی کے ذریعے مختلف جگہوں سے مختلف لوگوں کے چاند دیکھنے کی اتنی خبریں آجائیں کہ ان سب پر جھوٹ کا گمان نہ ہو سکے، مثلاً: مختلف ریڈیو اسٹیشنوں (Radio station) سے مختلف مقامات کے لوگوں کا چاند دیکھنا معلوم ہو جائے، تو اس قسم کی خبر پر عید بھی کی جا سکتی ہے، اس صورت میں بھی شہادت

---

(۱) امداد المفتین: ۴۸۴

(۲) آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام: ۱۸۹، رؤیتِ ہلال: ۵۰

(۳) آلاتِ جدیدہ: ۱۸۹

شرط نہیں ہے؛ مگر شرط یہ ہے کہ خبر دینے والے نے خود چاند دیکھا ہو، یا یہ بیان کرے کہ میرے سامنے فلاں شخص نے اپنا چاند دیکھنا بیان کیا یا فلاں شہر کی کمیٹی نے چاند کا فیصلہ کر دیا اور اس طرح مختلف مقامات کی خبریں مختلف اسٹیشنوں سے مل جائیں، تو عید بھی اس پر کی جا سکتی ہے۔''(۱)

اگر غیر مسلم اعلان کرے تو؟

ریڈیو پر رؤیتِ ہلال کا اعلان کرنے والا ''مسلمان ہونا ضروری ہے''، اگر چہ کہ ریڈیو کو اس کا پابند کیا جائے کہ وہ ازخود چاند کا اعلان نہ کرے؛ بل کہ علما کے فیصلے ہی کو ان ہی کے حوالے سے نشر کرے اور وہ اس کی پابندی بھی کرے کہ علما کی طرف سے جن الفاظ میں فیصلہ دیا گیا ہے، بلا ردو بدل اس کو نشر کرے، تب بھی کسی غیر مسلم کا اعلان کافی نہ ہوگا؛ کیوں کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ دیانات میں کافر کے قول کا اعتبار نہیں؛ چناں چہ لکھتے ہیں:

'' **لا یقبل قول الکافر في الدیانات.** ''(۲)

ترجمہ: کافر کے قول کا دیانات میں کوئی اعتبار نہیں۔

اسی طرح دیگر کتب میں بھی لکھا ہے؛ لہٰذا کافر کا اعلان معتبر نہیں ہوگا، **(واللہ اعلم۔)**

ٹیلی فون (Telephone) اور وائرلیس (Wireless) کی خبر

رمضان کے چاند کے لیے ٹیلیفون کی خبر کا اعتبار کیا جا سکتا ہے؛ جب کہ خبر دینے والا شناسا ہو اور اس کی آواز سے اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ فلاں آدمی ہے

---

(۱) تفصیل کے لیے: رؤیتِ ہلال: ۴۲-۴۳

(۲) فتاویٰ عالمگیری: ۵/۳۴۲

اور وہ شخص معتبر وثقہ ہو اور اگر آواز سے اس کو پہچانا نہ جا سکا؛ کیوں کہ فون پر ایسا ہوتا ہے کہ آواز سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ کون ہے؟ یا وہ آدمی معتبر وثقہ نہ ہو، تو اس کی خبر پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

عید کے چاند کے لیے چوں کہ مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں شہادت شرط ہے؛ اس لیے اس کے ذریعے موصول ہونے والی خبر عید کے لیے معتبر نہیں ہوگی، اگر چہ خبر دہندہ کو پہچان لیا جائے اور وہ معتبر بھی ہو اور مطلع ابر آلود بھی ہو؛ بہ ہر حال یہ خبر معتبر نہ ہوگی۔

مطلع صاف ہونے کی صورت میں رمضان وعید دونوں چاند کے لیے ایک جمِ غفیر کا دیکھنا شرط ہے؛ اس لیے اگر کسی جگہ ایسی عام رؤیت ہوئی ہو اور ٹیلی فون کے ذریعے معتبر آدمی اس کی خبر دے اور اس کی خبر پر چاند ہونے کا یقین یا ظنِ غالب حاصل ہو جائے، تو عید ورمضان دونوں کے لیے یہ خبر معتبر ہوگی۔

اسی طرح متعدد مقامات سے متعدد لوگوں کے فون ملیں اور ان میں کہا گیا ہو کہ میں نے چاند دیکھا ہے، یا فلاں شخص نے مجھے بتایا ہے کہ میں نے چاند دیکھا یا فلاں جگہ کی کمیٹی نے میرے سامنے چاند ہونے کا فیصلہ کیا ہے، تو دیکھا جائے کہ متعدد خبریں حدِ تواتر کو پہنچ گئی ہیں یا نہیں؟ اگر یہ حدِ تواتر کو پہنچ کر یقین یا کم از کم ظنِ غالب حاصل ہونے کا سبب بن جائیں، تو اس پر اعتماد کر کے عید ورمضان دونوں کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔[1]

وائرلیس کی خبریں بھی تمام احکامات میں ٹیلی فون کے مشابہ ہیں، جو اس کے احکام ہیں وہی وائرلیس کے احکام ہیں۔

---

(۱) رؤیتِ ہلال وآلاتِ جدیدہ: ۱۸۹

ٹیلی گرام (Telegram) پیجر (Pager) اور ٹیلیکس (Telex) کی خبر

تار(ٹیلی گرام) کے ذریعے رؤیتِ ہلال کی خبر کے سلسلے میں علمانے زیادہ احتیاط سے کام لیا ہے؛ کیوں کہ اس میں تار دینے والے کی نہ کوئی تحریر ہوتی ہے نہ دستخط ہوتے ہیں، جس سے تار دہندہ کی شناخت ہو سکے؛ پھر تار دینے والے اور تار حاصل کرنے والے کے درمیان عموماً غیر مسلموں کا واسطہ بھی ہوتا ہے؛ اس لیے علما میں سے بعض نے مطلقاً تار کی خبر کو نا قابلِ اعتبار قرار دیا ہے؛ چناں چہ حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے:

''بہ حسبِ ضوابطِ فقہیہ، مجرد اخبارات تار وغیرہ در بابِ حکمِ صوم وافطار معتبر نہیں۔'' (۱)

حضرت حکیم الامت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اولاً بعض شرائط کے ساتھ تار کی خبر کو معتبر قرار دیا تھا، پھر بعض نا گفتہ بہ حالات کے سامنے آنے پر ایک فتویٰ مرقومہ ۱۳۲۷ھ میں اس سے رجوع فرما کر، اس کو مطلقاً نا قابلِ اعتبار قرار دیا، پھر ایک اور فتوے میں، جو اس رجوع کے دو سال بعد ۱۳۲۹ھ میں لکھا ہے، بعض شرائط کے ساتھ تار کی خبر کو معتبر قرار دیا ہے۔ اس فتویٰ سے اور دیگر علما کے فتاویٰ سے جو شرائط کی تفصیل حاصل ہوئی ہے، اس کو میں اپنے الفاظ میں مرتب کر کے پیش کرتا ہوں:

تار کی خبر اس وقت معتبر ہوگی؛ جب کہ تار دہندہ شناسا ہو اور معتبر وثقہ ہو۔ (۲)

رمضان کے چاند کی خبر بہ ذریعے تار آئے اور مطلع صاف نہ

---

(۱) مجموعۃ الفتاویٰ (اردو): ۱/ ۴۰۷

(۲) امداد الفتاوی: ۲/ ۹۶

ہو، بل کہ ابر آلود ہو، تو اگر قرائن سے اس کا مصداق معلوم ہو جائے، تو اس کا اعتبار ہوگا۔ (۱)

عید کے چاند کی خبر اگر تار سے آئے، تو مطلع صاف ہونے کی صورت میں اس کا اعتبار نہ ہوگا، اگر صرف دو تین تار ہیں اور اگر تار زیادہ ہیں، مثلاً آٹھ دس ہیں اور ان سے ظنِ غالب حاصل ہو جائے؛ تو ان کا اعتبار کر کے عید کر سکتے ہیں۔ (۲)

اور اگر مطلع صاف نہ ہو، تو عید کے چاند کے لیے دو تین معتبر شناسا لوگوں کے تاروں کا اعتبار کیا جا سکتا ہے، جب کہ ظنِ غالب حاصل ہو جائے۔ (۳)

اور اگر متعدد جگہوں سے مختلف معتبر لوگوں کے تار آئے کہ میں نے چاند دیکھا ہے، یا فلاں نے میرے سامنے اپنا چاند دیکھنا بیان کیا، یا فلاں کمیٹی نے اس کو قبول کر کے چاند کا فیصلہ کر دیا ہے، تو اگر یہ تواتر کی حد تک پہنچ گئے ہوں، تو اس کی بنیاد پر عید و رمضان کا حکم کرنا درست ہے۔ (۴)

پیجر (Pager) اور ٹیلیکس (Telex) میں بھی چوں کہ خبر دینے والے کی کوئی شناخت نہیں ہو سکتی، جیسے تار میں نہیں ہو سکتی؛ اس لیے تمام احکام میں یہ تار کے مشابے ہیں، جو اس کے احکام ہیں، وہی ان کے بھی ہوں گے۔

---

(۱) عزیز الفتاویٰ:۲۷۳، فتاویٰ دار العلوم:۲/۶/۳۷۶، فتاویٰ باقیات:۱۰۰

(۲) امداد الفتاویٰ:۲/۹۳

(۳) امداد الفتاوی:۲/۹۳

(۴) فتاویٰ دار العلوم:۶/۳۸۱، ۶/۲/۳۷، آلاتِ جدیدہ:۱۸۹، رؤیتِ ہلال:۴۳

فیکس (Fax) کی خبر

دورِ حاضر کی حیرت انگیز ایجادات میں سے ایک فیکس (FAX) ہے، جس کے ذریعے فوری طور پر اپنی تحریر کا عکس سیکڑوں اور ہزاروں میل دور تک پہنچایا جاسکتا ہے، اگر کسی نے اس کے ذریعے چاند کی خبر بھیجی، تو اس کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس کا حکم وہی ہے، جو فقہائے کرام نے خط کا حکم بیان کیا ہے؛ وہ یہ ہے کہ اگر خط سے صاحبِ خط کی شناخت ہو جائے اور اطمینان ہو جائے کہ یہ اسی کا خط ہے اور وہ شخص ثقہ و عادل ہو، تو اس پر اعتماد کرنا درست و جائز ہے؛ چناں چہ دنیوی معاملات میں بھی عام طور پر خط کے ذریعے کام لیا جاتا ہے؛ اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ تجار اور صرّاف کا خط بہ وجہ عرفِ جاری کے حجت ہے؛ اسی طرح لوگوں کا آپس کے درمیان خط و کتابت کا جو معاملہ ہوتا ہے، یہ بھی معتبر ہے۔ (۱)

غرض! جب خط اور تحریر کے ذریعے اس پر اطمینان ہو جائے کہ یہ فلاں کا خط ہے اور وہ ثقہ بھی ہو، تو اس کا اعتبار کرنا درست ہے اور اگر خط سے پہچان نہ سکے یا شبہ رہ جائے، تو چوں کہ ایک خط کا دوسرے کے خط سے مشابہ بھی ہوتا ہے؛ لہٰذا اس پر عمل کرنا جائز نہ ہوگا؛ چناں چہ " **الأشباہ** " میں ہے "**لایعتمد علی الخط**" کہ خط پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ (۲)

مگر یہ اسی صورت میں ہے کہ تحریر پر اعتماد نہ ہو سکے اور صاحبِ تحریر کی شناخت نہ ہو سکے اور اگر تحریر سے صاحبِ تحریر کی شناخت ہو جائے، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، تو پھر فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق اس پر عمل جائز ہے۔

---

(۱) **الشامي**: ۵/۴۳۶

(۲) **الأشباہ و النظائر**: ۲/۳۰۶

جب یہ خط کا مسئلہ واضح ہوگیا، تو اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ فیکس کی خبر بھی اسی صورت میں قابلِ قبول ہوگی، جب کہ خط سے پوری طرح بھیجنے والے کی شناخت ہوجائے؛ ورنہ اس پر عمل کرنا درست نہ ہوگا۔

ای-میل (E Mail) کی خبر

E-Mail کی خبر کا کیا حکم ہے؟ یہاں اس کا ذکر بھی مناسب ہے؛ میرے نزدیک اس کا حکم ٹیلی گرام اور ٹیلکس کے مشابہ ہے؛ کیوں کہ اس میں بھی بھیجنے والے کی کوئی تحریر نہیں ہوتی، جس سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ یہ کس نے بھیجا ہے؛ بل کہ ٹیپ شدہ حروف ونقوش ہوتے ہیں، جس کو کوئی بھی ٹیپ کرکے روانہ کرسکتا ہے۔

البتہ اس میں اور ٹیلی گرام وٹیلکس میں ایک فرق ہے، وہ یہ کہ E-Mail کے پتے سے اندازہ لگانا ممکن ہے کہ کس نے بھیجا ہے اور یہ کہ وہ ہمارا شناسا ہے یا نہیں؛ نیز فوری طور پر اس کی تصدیق حاصل کرنا بھی آسان ہوتا ہے، اس کے برخلاف ٹیلی گرام وٹیلکس میں کوئی علامت ایسی نہیں ہوتی، جس سے بھیجنے والے کا اندازہ لگانا ممکن ہو۔

اس فرق کی وجہ سے E-Mail کو خط کے مشابہ قرار دیا جاسکتا ہے؛ لیکن جس طرح خط میں یقین سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ فلاں ہی کا خط ہے؛ بل کہ ایک اندازے سے ہی ہوسکتا ہے؛ کیوں کہ فقہائے کرام کے مطابق **"الخط یشبه الخط"** (ایک خط دوسرے خط کے مشابہ ہوتا ہے)؛ لہٰذا یہ امکان رہتا ہے کہ کسی اور کا خط ہو، اسی طرح اس میں بھی پتہ ہونے کے باوجود یہ امکان ہے کہ کسی اور نے اس پتے سے E-Mail کیا ہو؛ کیوں کہ ایسا بہت ہوتا ہے کہ لوگ کسی کا mail ID دھوکے سے معلوم کرلیتے ہیں اور اس کا غلط استعمال کرتے ہیں، تو اس

امکان کے ہوتے ہوئے اس پر کلی اعتماد نہیں کیا جا سکتا؛ اس لیے اس کی خبر کا حکم یہ ہے کہ جب تک تحقیق نہ ہو کہ یہ کس نے بھیجا ہے، اس پر عمل نہ کیا جائے اور اگر معلوم ہو جائے، تو پھر انہی شرائط کا لحاظ کیا جائے گا، جو ٹیلی گرام کے لیے بیان کیے گئے ہیں۔

اخبارات کی خبروں کا حکم

اخبارات کی خبر کا وہی حکم ہے، جو ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا حکم اوپر مذکور ہوا، مثلاً: متعدد اخبارات متعدد جگہوں کی رؤیتِ ہلال کی خبر دیں، تو وہ خبرِ متواتر ہے، اس کا اعتبار رمضان و عید دونوں کے لیے کیا جا سکتا ہے۔

مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”یہ صورت بھی استفاضے میں داخل ہے کہ مختلف شہروں سے مختلف لوگوں کے ذریعے رؤیتِ ہلال یا حکم بالرؤیت کی خبریں بہ حدِ تواتر موصول ہو جائیں، اس میں مختلف شہروں کے اخبار کی خبریں شامل ہیں، اخبارات کی خبر اگر حدِ تواتر کو پہنچ کر خبرِ مستفیض (مشہور) ہو گئی، تو اس پر عمل لازم ہے؛ خواہ ہلالِ رمضان کا قضیہ ہو یا دوسرے اَہِلَّہ (ہلال کی جمع) کا“۔ (۱)

اگر اوپر کی صورت کی طرح خبر مشہور نہ ہو؛ بل کہ ایک دو اخبار نے کسی جگہ کی رؤیت نقل کی ہو، تو اگر یہ ثقہ لوگوں کی خبر ہو، تو رمضان کے لیے اس پر عمل کرنا درست ہے، عید کے لیے درست نہیں۔ (۲)

---

(۱) امداد المفتین: ۴۸۸

(۲) امداد المفتین: ۴۸۸

موجودہ دَور میں عدالت کا معیار

یہ معلوم ہے کہ بعض صورتوں میں چاند کا ثبوت عادل آدمی کی خبر پر اور بعض صورتوں میں شہادت پر رکھا گیا ہے اور شہادت کے لیے بھی عدالت کی شرط ہے، ان مواقع پر فاسق و فاجر کی خبر و گواہی معتبر نہیں ؛ مگر موجودہ دَور میں ظاہری ترقی نے روحانیت وانسانیت کو جو تنزل کا تحفہ دیا ہے، اس نے ایک سوال یہ بھی پیدا کر دیا ہے کہ اب اگر چاند کے ثبوت کے لیے عدالت و شہادت کو ضروری قرار دیا جائے ،تو اکثر و بیشتر گواہیاں اور خبریں غیر معتبر قرار پائیں گی ؛ کیوں کہ عدالت وثقاہت سے متصف لوگ بہت کم ہیں، اب اس سلسلے میں عدالت کی شرط لگا کر لوگوں کی گواہی و خبر کو غیر معتبر قرار دیا جائے یا شرطِ عدالت میں کوئی ترمیم کی جائے گی؟

مگر حضراتِ فقہا نے اس سلسلے میں جس قدر عدالت کو شرط قرار دیا ہے، اس کے پیشِ نظر موجودہ دَور میں بھی عدالت کی تعریف میں کسی ترمیم کی ضرورت نہیں۔ علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے عدالت کی تعریف یہ بیان کی ہے:

" العدالة : أن يكون مجتنباً للكبائر، ولا يكون مصرًّا على الصغائر ، ويكون صلاحهُ أكثرَ من فسادهٖ ، وصوابُه أكثر من خطأه." (۱)

تَرجَمَۃ : عدالت یہ ہے کہ وہ شخص کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتا ہو اور صغیرہ گناہوں پر اصرار نہ کرتا ہو اور اس کی اچھائی اس کی برائی سے اور اس کی درستی اس کی خطا سے زیادہ ہو۔

اور اسی تعریف کو صاحبِ درِمختار نے اختیار کیا ہے اور علامہ ابن ہمام رَحِمَہُ اللّٰہُ

---

(۱) الدرالمختار مع الشامي :۸/ ۱۷۸

نے اس تعریف کو ''حسن'' قرار دیا ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ نے کتاب الصوم میں زیرِ بحث مسئلے ہی میں عدالت کی تعریف یہ کی ہے کہ

عدالت ایک ملکہ ہے، جو تقوے اور مروت کو لازم پکڑنے پر ابھارتا ہے، –اس کے بعد فرماتے ہیں کہ– شرط اس کا ادنیٰ مرتبہ ہے اور وہ کبائر اور اصرار علی الصغائر کا ترک ہے اور مروت کے خلاف کاموں کا چھوڑ دینا ہے۔ (۱)

پھر یہ عدالت کا ادنیٰ مرتبہ بھی خبر و گواہی دینے والے کی صرف ظاہری حالت پر رکھا گیا ہے کہ بہ ظاہر اگر نیک آدمی ہے، تو یہی بات کافی ہے۔

چناں چہ علامہ شامی رحمہ اللہ اپنے رسالے **''تنبیہ الغافل والوسنان''** میں جو انھوں نے رؤیتِ ہلال کے مسئلے پر ہی لکھا ہے، فرماتے ہیں:

''والشرع اکتفیٰ بالعدالة الظاهرة ، و فوّض الباطن إلیٰ العالم بالسرائر .''

ترجمہ: اور شریعت نے ظاہری عدالت کو کافی قرار دیا ہے اور باطن کو اللہ کی طرف سپرد کر دیا ہے، جو پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا ہے۔ (۲)

---

(۱) **'' قال :العدالة ملکة ، تحمل علیٰ ملازمة التقویٰ والمروء ة ، والشرط أدناها وهو'' ترک الکبائر والإصرار علی الصغائر و ما یخل بالمروء ة '' .**

(الشامي : ۳/۳۵۲)

(۲) **مجموعة رسائل ابن عابدین :۱/۲۳۶**

الغرض! موجودہ دور میں اگر چہ فسق ظاہر ہے؛ لیکن ایسے لوگوں کا وجود، جن کو مذکورہ تعریف پر عادل کہا جائے، نا پید و نا در نہیں ہے؛ اس لیے عدالت کی تعریف میں ترمیم کا سوال، نا قابلِ التفات ہے، اسی لیے حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب رحمہ اللہ نے ''فتاویٰ دارالعلوم'' میں اس سلسلے میں کسی بھی ترمیم کی گنجائش نہیں دی ہے۔

چناں چہ حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ

> عدل کی وہی تفسیر اب بھی ہے، جو فقہا نے لکھی ہے، وہی معتبر ہے، اختلافِ عصر (زمانے) سے عدالت کی تعریف میں کوئی فرق نہیں پڑے گا، جس جگہ فقہا نے عدالت شرط کی ہے، وہاں ایسی ہی عدالت کی ضرورت ہے اور جہاں مستور کی گواہی بھی کافی ہے، جیسے روزہ رکھنے میں اور اثبات رمضانیت میں، وہاں ثبوتِ عدالت کی ضرورت نہیں؛ مگر فسق بھی ظاہر نہ ہو۔ (۱)

ہاں! بعض اوقات اس سلسلے میں پریشانی لاحق ہوسکتی ہے، وہ اس طرح کہ کسی علاقے میں کسی وقت فسق کی کثرت کے باعث ہوسکتا ہے کہ عام معاملات کی شہادت میں ایسے ہی لوگ سامنے آئیں، جو شرعی اصول کے لحاظ سے مردود الشہادت و فاسق ہوں، مثلاً: ڈاڑھی منڈانے یا کٹانے کے عادی لوگ، ٹخنے کے نیچے پاجامہ یا پتلون پہننے کے عادی لوگ وغیرہ، تو ایسی صورت میں حکم یہ ہے کہ اگر اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ یہ لوگ جھوٹ کے عادی نہیں، تو ان کی بات معتبر مانی جائے گی؛ کیوں کہ شریعت میں فاسق کی خبر یا شہادت کو رد کرنے کا حکم نہیں ہے؛ بل کہ اس کی بات کی تحقیق کرنے کا حکم دیا گیا ہے، حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ

(۱) فتاویٰ دارالعلوم: ۶/۳۵۰

نے اپنے رسالے ''رؤیتِ ہلال'' میں فقہ کی مشہور کتاب ''**معین الاحکام**'' کے حوالے سے اس کو نقل کر کے لکھا ہے کہ: '' **معین الاحکام** ''میں اس کو صواب اور معمول بہ قرار دیا ہے۔ (۱)

چاند پر رہنے والوں کے لیے رؤیتِ ہلال کا مسئلہ

چاند پر اگر چہ ابھی تک آبادی نہیں ہوئی ہے؛ تاہم اہلِ سائنس کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چاند پر آبادی کے سلسلے میں بہت ہی پُر امید ہیں اور قریب میں یہ انکشاف بھی ہوا ہے کہ چاند میں برف موجود ہے، جو علامت ہے اس کی کہ وہاں پانی پایا جاتا ہے، اہلِ تحقیق نے اس کی بنا پر پیش گوئی کی ہے کہ چاند پر آبادی جلد متوقع ہے۔

اس صورت پر ذہنوں میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ اگر وہاں آبادی ہوگی، تو چاند والوں کے لیے ''رؤیتِ ہلال'' کا کیا مسئلہ ہوگا ؟ کیوں کہ جب وہ لوگ خود ہلال یعنی چاند میں ہیں، تو وہ کیا دیکھ کر رمضان وعید کریں گے؟

احقر نے اس سلسلے میں بعض علما سے تحقیق کی اور مختلف جوابات ملے:

حضرت فقیہ الملت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ سے بندے نے ایک مجلس میں سوال کیا، تو فرمایا کہ

> ''جب وہاں آبادی ہی نہیں، تو جواب کی کیا ضرورت ہے؟ بعض علما نے جواب میں فرمایا کہ ''چاند والے زمین کو دیکھ کر رمضان وعید کریں گے؛ کیوں کہ چاند پر زمین، چاند کی طرح دکھائی دیتی ہے۔

حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالنپوری دامت برکاتہم نے درسِ حدیث

---

(۱) رؤیتِ ہلال: ۳۷

کی تقریر میں یہ بیان فرمایا، جب کہ بندہ ایک موقع پر حاضر ہوا تھا۔

بعض علماء نے فرمایا کہ: چاند والے، زمین والوں کی اتباع کریں گے اور ظاہر ہے کہ چاند پر رہنے والے دیگر معاملات میں بھی زمین والوں کے تابع ہوں گے، تو اس میں بھی وہ اہلِ زمین کی اتباع کریں گے، راقم نے حضرت مولانا احمد رضا بجنوری رحمہ اللہ شارحِ بخاری سے بہ ذریعے خط اس سلسلے میں سوال کیا، تو یہی جواب دیا، احقر کا رجحان بھی اسی کی طرف ہے؛ کیوں کہ حدیث میں ''چاند'' دیکھنے پر روزہ وافطار کا مدار رکھا ہے، اب چاند کے قائم مقام زمین کو قرار دینا کسی دلیل سے ہی ہوسکتا ہے، (ولم یُوجَد)

لہٰذا چاند والوں کے لیے بھی چاند ہی کی رؤیت پر مدار ہوگا؛ البتہ وہ خود نہ دیکھ سکیں، تو اہلِ زمین کا اتباع کریں گے۔ **واللہ أعلم**۔

ابر آلود مطلع والے علاقوں کا حکم

جن علاقوں میں بالعموم مطلع ابر آلود رہتا ہے اور بہت کم چاند کی رؤیت ۲۹/ تاریخ کو ممکن ہوتی ہے، ایسی جگہوں پر ہمیشہ ۳۰/ دن کا مہینہ شمار کر کے رمضان وعیدین کا فیصلہ کرنا صحیح نہیں؛ بل کہ ایسے علاقوں میں ان کے قریب کے علاقوں کی رؤیت کا اعتبار کرنا چاہیے؛ جب کہ مطلع دونوں کا ایک ہو، ہمیشہ تیس دن کا اعتبار کرنا اور اس کے قرب وجوار کے متحد المطلع علاقوں کی رؤیت کا اعتبار نہ کرنا صحیح نہیں، اسی طرح محض ماہرینِ فلکیات کا قول بھی اس بارے میں معتبر نہ ہوگا۔

ہندوستان میں سعودی عرب کے مطابق رمضان وعید-ایک علمی وفقہی تبصرہ

عام طور پر رمضان وعید کے چاند میں ہمارے ہندوستان میں، نیز بعض اور ممالک میں اور سعودی عرب میں ایک یا دو دن کا اختلاف ہوتا ہے، اس موقعے پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب سعودی میں چاند نظر آ گیا، تو سب کو اسی کا اتباع کرنا چاہیے اور بعض لوگ ایسا کرتے بھی ہیں کہ سعودی چاند کے حساب سے ہی یہاں روزے رکھتے اور عید مناتے ہیں، ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک لندن، امریکہ وغیرہ بعض اور ممالک میں بھی یہی اختلاف لوگوں میں دیکھنے و سننے کو ملتا ہے، اس سلسلے میں کیا صحیح ہے؟ اور جو لوگ سعودی عرب کی اتباع کرتے ہیں ان کی یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟ احقر کے پاس ایک صاحب کا اس سلسلہ میں سوال آیا، تو اس کا جواب احقر نے لکھا اور وہ مسئلے کی صورتِ حال کی وجہ سے ذرا تفصیلی لکھا گیا، یہاں اسی جواب کو پیش کیا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے ایک بات یہ سمجھ لیں کہ اہلِ علم میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ ایک جگہ چاند نظر آ جائے، تو دوسرے تمام مسلمانوں پر اس کا اتباع لازم ہے یا نہیں؟ اس میں متعدد اقوال ہیں اور اس میں اکثر علما کا مختار و معتمد قول یہ ہے کہ ’’اختلافِ مطالع کی وجہ سے، ایک جگہ کا چاند لازمی طور پر دوسری جگہ کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوتا؛ کیوں کہ یہ بات مسلّم ہے کہ چاند کے مطالع میں علاقے کے لحاظ سے اختلاف ہوتا ہے؛ لہٰذا یہاں کے لوگ یہاں کے مطلع کا اور وہاں کے لوگ وہاں کے مطلع کا اعتبار کریں‘‘۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی اسی رائے ونظریے کو اختیار کیا ہے؛ نیز" **المجمع الفقه الإسلامي (جده)** "نے بھی اپنی قرارداد میں اسی کی تائید کی ہے، جیسا کہ ہم نقل کریں گے، اس پر تفصیلی کلام ہماری کتاب "نفائس الفقہ" میں دیکھیے ؛ تاہم ایک نقطۂ نظر کے مطابق یہ گنجائش ہے کہ کوئی سعودی عرب کا اتباع کرلے؛ مگر یہاں جس اہم پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص ایک ایسی بستی میں ہو، جہاں اہلِ علم کی کمیٹی ہو اور وہ رؤیتِ ہلال کے بارے میں جان کاری لیتی ہو اور سب کے لیے ایک لائحہ سناتی ہو اور وہاں کے مسلمان اس کمیٹی کے فیصلوں کا اعتبار کرتے ہوئے روزہ وعید کرتے ہوں، ایسی جگہ میں کسی کا یہ نعرہ لگانا کہ سعودی میں جو فیصلہ ہوا، ہم اس کی اتباع کرتے ہیں اور وہی قابلِ اتباع ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ ایک تو اس لیے کہ یہ کہنے والے سعودی کے علاوہ میں اگر چاند پہلے ہو، تو اس کو ماننے تیار نہیں ہوتے ؛ حال آں کہ اسلام میں سعودی کی تخصیص کی کوئی دلیل نہیں اور نہ کسی امام کا مسلک ہے کہ صرف سعودی کے چاند کا اعتبار ہے۔ دوسرے اس لیے کہ اس سے امت میں انتشار واختلاف پیدا ہوتا ہے، جو کہ صحیح نہیں۔

یہاں ہم اس سلسلے کے چند اہم فیصلے وفتاویٰ نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں، تا کہ بات واضح ہوجائے، سب سے پہلے ہم سعودی عرب کے بڑے بڑے علما کی مجلس کا متفقہ فیصلہ نقل کرتے ہیں، جس کو " **مجلس هيئة كبار العلماء** " کہا جاتا ہے، اس مجلس نے جو فیصلہ کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

> "چاند کے مطلع میں اختلاف کا ہونا ان امور میں سے ہے، جو حِسًّا وعقلاً معلوم ہیں اور اس میں کسی بھی عالم کا اختلاف نہیں، ہاں! اس میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ اختلافِ مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں ہے؟ اور اختلافِ مطالع کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ ان نظری

مسائل میں سے ہے، جن میں اجتہاد کی گنجائش ہے اور اس میں ان حضرات کی جانب سے اختلاف ہوا ہے، جن کو علم و دین میں ایک شان حاصل ہے اور یہ وہ جائز اختلاف ہے، جس پر حق کو پا جانے والے کو دو اجر ایک اجتہاد کا اور ایک حق کو پانے کا ملے گا اور خطا کرنے والے کو ایک اجر ملے گا؛ پس اس دین پر چودہ صدیاں گزر گئیں، جس میں سے کبھی بھی ایک ہی رؤیت پر پوری امتِ اسلامیہ کا اتحاد ہوا ہو، یہ ہم نہیں جانتے ؛ لہٰذا کبارِ علما کی اس مجلس کا نظریہ یہی ہے کہ اس مسئلے کو اپنی سابقہ حالت پر رہنے دیا جائے اور اس موضوع کو نہ چھیڑا جائے اور یہ کہ ہر ملک کے لوگوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے علما کے واسطے سے، ان میں سے جس رائے کو چاہیں اختیار کریں۔ (۱)

اس اصولی بحث کے بعد خاص زیرِ بحث صورت کے بارے میں بھی علمائے عرب کے فتاویٰ ملاحظہ کیجیے کہ وہ کیا فرماتے ہیں؟

سعودی عرب کے معروف عالمِ دین اور وہاں کے مفتیِ اعظم ''علامہ شیخ عبد العزیز بن باز رحمہ اللہ '' کا فتویٰ نقل کرتا ہوں، جو اس سلسلے میں نہایت واضح و بصیرت افروز ہے، اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ

''الذي يظهر لنا من حكم الشرع المطهر، أن الواجب عليكم الصوم مع المسلمين لديكم ؛ لأمرين: أحدهما : قول النبي صلى الله عليه وسلم : (الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والأضحىٰ يوم تضحون) خرَّجهٗ أبو داود وغيره باسناد حسن ، فأنت و إخوانک مدة وجودكم

(۱) بہ حوالہ: فتاویٰ اللجنة الدائمة: ۱۰/ ۱۰۹-۱۱۱

في الباكستان ينبغي أن يكون صومكم معهم حين يصومون ، و افطاركم معهم حين يفطرون ، لأنكم داخلون في هذا الخطاب ، و لأن الروية تختلف بحسب اختلاف المطالع ، و قد ذهب جمع من أهل العلم منهم ابن عباس رضي الله عنه إلىٰ أن لأهل كل بلدة رؤيتهم . الأمر الثاني : أن في مخالفتكم المسلمين لديكم في الصوم والإفطار تشويشاً و دعوةً للتساؤل والاستنكار وإثارةً للنزاع والخصام ، والشريعة الإسلامية الكاملة جاء ت بالحث على الاتفاق والوئام والتعاون على البر والتقوىٰ ، و ترک النزاع والخلاف الخ ".[1]

ترجمہ: اس سلسلے میں پاکیزہ شریعت کا جو حکم ہمارے سامنے واضح ہوا، وہ یہ ہے کہ آپ پر اپنے یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ روزہ رکھنا واجب ہے، اس کی دو وجوہ ہیں: ایک یہ کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''روزہ اس دن ہے، جس دن تم (مسلمان) روزہ رکھو اور افطار یعنی عید اس دن ہے، جس دن تم مسلمان افطار کرو اور قربانی اس دن ہے، جس دن تم قربانی کرو''۔ اس حدیث کو ابوداود رحمہ اللہ وغیرہ نے سندِ حسن سے روایت کیا ہے؛ لہٰذا آپ اور آپ کے بھائی جب تک پاکستان میں ہیں، آپ پر ضروری ہے کہ وہاں کے مسلمان جب روزہ رکھیں، اس وقت ان کے ساتھ روزہ رکھیں اور وہ جب افطار (یعنی عید) کریں اس وقت ان کے ساتھ

(۱) مجموعة فتاویٰ ابن باز: ۱۰۳/۱۵-۱۰۴

افطار کریں؛ کیوں کہ آپ بھی اس خطاب میں داخل ہیں اور اس لیے بھی کہ اختلافِ مطالع کی وجہ سے رؤیت میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور علما کی ایک جماعت، جن میں ابن عباس رضی اللہ عنہ بھی ہیں، اس طرف گئی ہے کہ ہر بستی والوں کے لیے ان کی اپنی رؤیت کا اعتبار ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تمہارا وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ روزے و افطار میں اختلاف کرنا تشویش و انتشار اور سوال جواب کے سلسلے کی دعوت اور نزاع و اختلاف کو بھڑکانے کا باعث ہے؛ جب کہ اسلامی شریعتِ کاملہ اتفاق و اتحاد اور ایک دوسرے سے تقویٰ و نیکی میں تعاون پر ابھارتی ہے اور ترکِ اختلاف کی تعلیم دیتی ہے۔

شیخ ابن باز رحمہ اللہ نے اسی سلسلے کے ایک سوال کے جواب میں ایک اور فتوے میں لکھا ہے کہ

"على المسلم أن يصوم مع الدولة التي هو فيها و يفطر معها لقول النبي صلى الله عليه وسلم «الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والأضحىٰ يوم تضحون.» والله أعلم."[1]

ترجمہ: مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اس ملک کے لوگوں کے ساتھ روزہ رکھے اور افطار کرے، جس میں وہ رہتا ہے؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: روزہ اس دن ہوگا، جس میں تم روزہ رکھو اور افطار اس دن، جس میں تم افطار کرو اور قربانی اس دن، جس میں تم قربانی کرو، واللہ اعلم۔

---

(۱) فتاویٰ الشیخ ابن باز: ۱۷۵/۳

اور معروف عربی عالم ومفتی علامہ ''شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ'' نے اپنے بعض فتاویٰ میں اگرچہ اس کی اجازت دی ہے کہ علما کے ایک نظریے کے مطابق کوئی چاہے، تو مملکتِ سعودیہ کی اتباع کرسکتا ہے، تاہم ہم نے جہاں اختلاف و انتشار پیدا ہونے کا خطرہ محسوس کیا، تو اس سے منع کیا ہے اور یہی کہا ہے کہ ہر علاقے کے لوگوں کو اپنے یہاں کے لوگوں کے ساتھ ہی روزہ وعید کرنا چاہیے، اس سلسلے میں ان کے ایک دو فتاویٰ ملاحظہ کیجیے، ان سے کسی نے سوال کیا ہے کہ

''ہم فلاں ....ملک میں خادم الحرمین کی جانب سے سفیر ہیں، یہاں ہمیں رمضان المبارک کے روزوں اور عرفے کے روزے کے بارے میں پریشانی ہے، اس بارے میں ہمارے ساتھی تین قسم کے ہیں: ایک وہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہم مملکتِ سعودیہ کے ساتھ روزہ رکھیں گے اور افطار، یعنی عید بھی کریں گے۔ دوسرے وہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہم جس ملک میں ہیں، وہاں کے مطابق روزہ و عید کریں گے اور تیسرے وہ ہیں، جو کہتے ہیں کہ ہم روزہ تو اس ملک کے مطابق رکھیں گے اور یومِ عرفہ سعودی کے مطابق مانیں گے۔ آپ اس میں شافی جواب سے رہنمائی کریں۔

اس سوال کے جواب میں علامہ العثیمین نے لکھا کہ

''ایک ملک میں چاند نظر آئے اور دوسرے میں نہ دکھائی دے، تو اس بارے میں علما کا اختلاف ہے کہ کیا تمام مسلمانوں پر اس پر عمل لازم ہے یا صرف ان پر، جنھوں نے دیکھا اور جو ان کے مطلع میں ان کے موافق ہیں، یا صرف ان پر جو ایک ولایت کے تحت رہتے ہیں؟ اس میں متعدد اقوال ہیں اور اس میں راجح قول یہ ہے کہ اگر دو

ملکوں کا مطلع ایک ہو، تو وہ ایک مانا جائے گا؛ لہٰذا ان میں سے ایک جگہ چاند دکھائی دے، تو دوسرے ملک میں بھی اس کا حکم ثابت ہوگا؛ لیکن اگر مطلع میں اختلاف ہو، تو ہر ملک کا الگ حکم ہوگا........(پھر اس کے دلائل ذکر کر کے فرماتے ہیں)........اس بنا پر تم لوگ روزہ رکھو اور افطار کرو، جس طرح کہ اس ملک کے لوگ کرتے ہیں، جس میں تم لوگ ہیں، خواہ وہ تمہارے اصل وطن (سعودی عرب) کے موافق ہو یا اس کے خلاف ہو۔ (۱)

اسی طرح شیخ العثیمین نے اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ

''مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کا کلمہ ایک ہو اور وہ اللہ کے دین میں تفرقہ نہ ڈالیں اور یہ کہ ان کا روزہ اور ان کی عید بھی متحد ہو اور وہ اپنے یہاں کے دینی مرکز کی اتباع کریں اور وہ اختلاف نہ کریں؛ حتی کہ اگر ان کے یہاں روزہ سعودی مملکت یا کسی اور اسلامی ملک کے لحاظ سے بعد ہی میں کیوں نہ ہو، بہ ہر حال وہ اپنے مرکز کا اتباع کریں۔ (۲)

سعودی عرب کے مشہور دار الافتا '' **اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والإفتاء** '' کے فتاویٰ میں بھی یہی بات کہی گئی ہے، ایک سوال اس کے مفتیان سے کیا گیا ہے کہ

''ہم ریڈیو سے سعودیہ میں چاند ہو جانے کی خبر سنتے ہیں؛ جب کہ ہمارے یہاں چاند نظر نہیں آتا، تو بعض لوگ اس پر روزہ رکھ لیتے

---

(۱) فتاویٰ الشیخ العثیمین: ۱۷/۳۹-۴۱

(۲) فتاویٰ العثیمین: ۱۷/۵۲

ہیں اور اکثر لوگ انتظار کرتے ہیں، اس سے بہت سخت اختلاف پیدا ہوگیا ہے؛ لہٰذا اس سلسلے میں فتویٰ دیں؟

اس کے جواب میں فتوے میں اولاً اختلافِ مطالع کا ذکر اور اس میں ائمہ کے مسالک کا ذکر کیا گیا ہے، پھر آخر میں لکھتے ہیں کہ جب ریڈیو یا کسی اور ذریعے سے اپنے علاقے کے مطلع کے علاوہ کسی اور جگہ چاند ہو جانے کا ثبوت ہو، تو آپ لوگوں پر لازم ہے کہ روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا معاملہ وہاں کے حاکم کے حوالے کردیں۔ (۱)

اسی طرح ایک اور فتوے میں لکھتے ہیں کہ اگر اختلاف ہو، تو وہاں اگر مسلمان حاکم ہو، تو اس کا فیصلہ لیں اور اگر مسلمان نہ ہو، تو وہاں کے مرکزِ اسلامی کی مجلس کا فیصلہ مانیں؛ تاکہ اس ملک کے مسلمانوں کا روزے و عید میں اتحاد باقی رہے۔ (۲)

اور سعودی عرب کے ہی ایک اور معروف عالم ''علامہ شیخ صالح بن فوزان رحمہ اللہ'' سے سوال کیا گیا کہ

''اگر کسی اسلامی مملکت مثلاً: سعودی میں رمضان کے آنے کا ثبوت ہو جائے اور دوسرے ممالک میں اس کے آنے کا اعلان نہ ہو، تو کیا حکم ہے؟ کیا ہم سعودیہ کے مطابق روزہ رکھیں؟ اور دونوں ممالک میں اختلاف ہو، تو کیا حکم ہے؟

شیخ صالح بن فوزان رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ

''ہر مسلمان اپنے ملک میں موجود مسلمانوں کے ساتھ روزہ و افطار کرے اور مسلمانوں پر اپنے علاقے میں رؤیت کا اہتمام کرنا

---

(۱) فتاویٰ اللجنة الدائمة :۱۰/ ۹۷-۹۸

(۲) فتاویٰ اللجنة الدائمة :۱۰/ ۱۰۱-۱۰۲

لازم ہے اور وہ لوگ دوسرے ایسے علاقے کی رؤیت پر روزہ نہ رکھیں جو دوری پر واقع ہو؛ کیوں کہ مطالع مختلف ہیں اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ کچھ مسلمان کسی غیر اسلامی ملک میں ہیں اور وہاں مسلمان نہیں ہیں، جو رؤیت کا اہتمام کریں، تو وہ لوگ سعودیہ کے ساتھ روزہ رکھیں، تو کوئی حرج نہیں''۔ (۱)

یہ علمائے عرب میں سے معروف اصحابِ افتا کے چند فتاوے ہیں، جن سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی، جو یہاں یا کہیں اور رہتے ہوئے سعودی عرب کے چاند پر رمضان وعید کرتے ہیں؛ لہٰذا ان کو اس طرح کی غلطی سے باز آنا چاہیے اور مسلمانوں میں اختلاف وانتشار پھیلانے سے احتراز کرنا چاہیے۔

رؤیتِ ہلال کمیٹی اگر فتوے کے خلاف کرے تو؟

رؤیتِ ہلال کمیٹی میں کوئی شخص دینی علم رکھنے والا نہ ہو اور اگر ہو، بھی تو اس کی رائے غلبۂ آرا میں دب کر رہ جائے اور مفتی کے فتوے کے خلاف شہر کی رؤیتِ ہلال کمیٹی اپنا حکم نافذ کرنا چاہے، تو کیا کرنا چاہیے؟

اس کا جواب یہ کہ رؤیتِ ہلال کمیٹی کو مفتی کے فتوے کے ماتحت رہنا اور کام کرنا ضروری ہے، ورنہ وہ کمیٹی شرعاً معتبر نہیں ہوگی اور اس کے اعلانات شرعی اعلانات نہ ہوں گے، ان پر عمل کرنے کی اجازت نہ ہوگی، جو کمیٹی عالمِ دین کی بات -جب کہ وہ شرعی دلیل کے ساتھ ہو- تسلیم نہ کرے، تو عالمِ دین کو کمیٹی سے علیاحدہ ہوکر اعلان کردینا چاہیے، کہ یہ لوگ حکمِ شرعی تسلیم نہیں کرتے ہیں اور اپنی رائے پر عمل

---

(۲) المنتقیٰ: ۳/۱۲۴

کرتے ہیں، ان کی رائے شرعاً معتبر نہیں، میں ان سے علاحدہ ہوتا ہوں۔ (۱)

رمضان کا چاند اور ریڈیو پاکستان کی ایک دل چسپ غلطی

کراچی ۱۰/ مارچ (بہ ذریعے ڈاک) ریڈیو پاکستان، کراچی نے اپنی دانستہ غلطی سے کراچی کے باشندوں کو الجھن میں ڈال دیا ہے، بتایا گیا ہے کہ "مولانا احتشام الحق تھانوی رحمہ اللہ" نے رمضان کا چاند نظر آنے کی صورت میں ریڈیو پاکستان سے نشر کرنے کے لیے اپنی تقریر ریکارڈ کرائی تھی، آج چاند نظر آنے کی امید تھی؛ لیکن نظر نہیں آیا، ادھر ریڈیو پاکستان کے ذمہ داروں نے سمجھا کہ چاند نکل آیا ہے؛ چناں چہ اس غلط فہمی کے نتیجے میں انہوں نے مذکورہ بالا تقریر کا ریکارڈ نشر کر دیا، جس میں مولانا نے کراچی کے باشندوں کو یہ خوش خبری سنائی تھی کہ ماہِ رمضان شروع ہو گیا ہے، بعد میں ریڈیو پاکستان نے اپنی غلطی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی۔ (۲)

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ: ۱۵/۶۰

(۲) اخبار روزنامۂ سیاست کان پور ۱۸/ مارچ ۵۹ء مطابق ۸/ رمضان ۷۸ھ بہ حوالۂ فتاویٰ محمودیہ: ۱۵/۱۱۵

روزہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روزہ

سائرن (Siren) توپ وغیرہ کی آواز پر سحری وافطار

سحری یا افطار کے وقت کو بتانے کے لیے آج کل سائرن اور توپ کو استعمال کیا جاتا ہے اور لوگ اس پر اعتماد کر کے سحری اور افطار کرتے ہیں، یہ درست اور جائز ہے۔ توپ اور طبل کی آواز پر اعتماد کو فقہائے کرام نے صراحۃً جائز قرار دیا ہے؛ چناں چہ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

عادل آدمی کے قول پر سحری کرنا درست ہے، اسی طرح طبل پر۔ (۱)

اسی طرح توپ کی آواز پر اعتماد کو بھی درست لکھا ہے۔ (۲)

مگر اس سلسلے میں علامہ شامی رحمہ اللہ کے کلام سے بعض شرائط مستفاد ہوتی ہیں، ان کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ علامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

" إن المدفع في زماننا يفيد غلبة الظن ، وإن كان ضاربهٗ فاسقاً ؛ لأن العادة أن الموقت يذهب إلىٰ دار الحكم آخر النهار فيعيّن لهٗ وقت ضربهٖ ويعيّنه أيضاً للوزير وغيره ، وإذا ضربه يكون ذالک بمراقبة الوزير و أعوانهٖ للوقت المعيّن فيغلب على الظن بهٰذه القرائن

(۱) قال الشامي: يتسحر بقول عدل ، وكذا بضرب الطبول. (الشامي:۳/۳۸۳)

(۲) قال: لو أفطر أهل الرستاق بصوت الطبل لم يكفروا. (الشامي:۳/۳۸۳)

عدم الخطأ و عدم قصد الفساد .''(۱)

ترجمۃ: ہمارے زمانے میں توپ سے ظنِ غالب حاصل ہو جاتا ہے، اگر چہ اس کا اڑانے والا فاسق ہو؛ کیوں کہ توپ کو مقرر کرنے والا (حاکم یا قاضی امیر وغیرہ) دن کے آخر (افطار کے قریب) دارالحکم جا کر توپ اڑانے والے کو اس کا وقت بتاتا ہے اور پھر اس کے لیے وزیر وغیرہ کو بھی مقرر کرتا ہے اور جب وہ اڑاتا ہے، تو یہ وزیر اور اس کے اعوان وانصار کے سامنے ہوتا ہے اور وقتِ مقررہ پر ہوتا ہے، پس ان قرائن سے ظنِ غالب حاصل ہوتا ہے کہ یہاں خطاو غلطی یا فساد کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔

اس میں علامہ شامی رحمہ اللہ جن قرائن کی بنیاد پر اس زمانے کے توپ سے غلبۂ ظن کا حاصل ہو جانا مان کر، اس پر افطار کی اجازت دے رہے ہیں، ان سے ہم بھی استفادہ کر سکتے ہیں، سائرن میں بھی اور دیگر اس طرح کی چیزوں میں بھی۔

۱–ایک شرط تو یہ ہے کہ کسی اچھے دین دار آدمی کی طرف سے اس کا انتظام ہو، اگر چہ بجانے والا دین دار نہ ہو۔

۲–دوسرے یہ کہ ہمیں یہ معلوم ہو کہ اس کا منتظم کسی کو اس کے بجانے پر مقرر کیا ہوا ہے۔

۳–تیسرے یہ کہ اس کے لیے وقتِ مقررہ پر بجانے کی شرط ہو۔

۴–چوتھے یہ کہ بجانے والا منتظم یا اس کی طرف سے مقرر کردہ اچھے آدمی کے سامنے بجائے؛ لہٰذا اگر کہیں سے آواز آئی اور ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ یہ آواز کیوں اور

(۱) الدر المختار مع الشامي:۳/۳۸۳

کس لیے بجائی جارہی ہے، تو اس پر روزہ افطار درست نہ ہوگا، اسی طرح ہم کو اگر یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا باقاعدہ انتظام ہے، تو بھی اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اسی پر مسجد کے مؤذن کی آواز کو بھی قیاس کرنا چاہیے اور چوں کہ ہمارے ان علاقوں میں اکثر اس قسم کا انتظام ہوتا ہے؛ اس لیے اس پر اعتماد درست ہے۔

سائرن (Siren) توپ کی آواز، قمقموں کی روشنی پر رمضان وعید

بعض جگہ رمضان کی آمد یا عید کے اعلان کے طور پر سائرن یا توپ یا لائٹ استعمال کیے جاتے ہیں کہ لوگ سائرن اور توپ کی آواز سے اور روشنی دیکھ کر سمجھ لیتے ہیں کہ رمضان یا عید کا چاند نظر آ گیا ہے، فقہا کے کلام سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے؛ چناں چہ مولانا عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ نے علامہ شامی رحمہ اللہ کی ایک عبارت، جس میں کہا گیا ہے کہ دیہات والوں کو قندیل وغیرہ دیکھ کر روزہ رکھ لینا ضروری ہے، نقل کر کے فرماتے ہیں:

> ’’درست ہوگا (یعنی توپ کی آواز پر عید کرنا) اس وجہ سے کہ توپیں چلنا موافقِ عادتِ شائعہ کے موجبِ ظنِ عید ہونے کے ہے اور غلبۂ ظن عمل کے واسطے کافی ہے‘‘۔ (۱)

توپ کی طرح اس زمانے میں سائرن کی آواز اور بلب کی روشنی سے بھی ظنِ غالب حاصل ہو جاتا ہے کہ چاند ہو گیا؛ لہٰذا اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؛ مگر یہ صرف وہاں کے لیے حکم ہے، جہاں اس طرح کا رواج ہو، ورنہ یہ حکم نہ ہوگا۔

---

(۱) مجموعۃ الفتاویٰ: ۱/ ۳۹۵

طویل الاوقات علاقوں میں روزے کے اوقات

انسانی آبادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے اب ان علاقوں اور خطوں کو بھی آباد کر دیا ہے، جو برس ہا برس تک غیر آباد تھے اور لوگ وہاں ہونے کو ہلاکت و بربادی کا سبب قرار دیتے تھے؛ چناں چہ اب بعض ایسے علاقے بھی آباد ہو چکے ہیں، جہاں کئی کئی ماہ تک سورج طلوع نہیں ہوتا یا غروب نہیں ہوتا، ایسے لوگوں کے لیے جو وہاں آباد ہیں، روزے کے کیا اوقات ہوں گے؟ یہ سوال بہت اہمیت کا حامل ہے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ طویل الاوقات علاقے دو قسم کے ہیں:

ایک وہ جہاں دن ورات کا مجموعہ چوبیس گھنٹوں کا ہوتا ہے، اگر چہ دن ورات کے اوقات میں تناسب نہ ہو؛ بل کہ فاحش فرق ہو، جیسے لندن (London) برطانیہ (Britain) کا گرمی کے موسم میں دن بہت بڑا ہوتا ہے، یعنی ۱۷/ ۱۸/ گھنٹے کا دن ہوتا ہے، ایسے علاقوں میں روزہ اسی حساب سے رکھنا چاہیے، جیسے عام علاقوں میں رکھتے ہیں کہ صبح صادق سے غروبِ آفتاب تک؛ کیوں کہ ایسے علاقوں میں رہنے والوں کو اس کی عادت ومشق بھی ہوتی ہے، حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ (۱)

البتہ کمزور افراد کو اس کی برداشت نہ ہو سکے، تو ان کے لیے یہ اجازت ہو سکتی ہے کہ وہ دوسرے دنوں میں، مثلاً سردی کے دنوں میں قضا رکھ لیں، جیسا کہ مریض

---

(۱) چناں چہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ اس سلسلے میں طویل کلام فرما کر لکھتے ہیں کہ

''جس جگہ نہار کا طول بہ قدرِ تحملِ صوم ہو اور فطرۃً ان کا تحمل ہم سے زائد ہو- **لأنهم معتادون بطول النهار، وطول أكثر الأعمال فيه**- وہاں روزہ رکھیں۔ (امداد الفتاویٰ:۱/۵۰۴)

لوگوں کو اس کی اجازت ہے۔(۱)

دوسرے وہ علاقے، جن کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے کہ دن و رات کا مجموعہ کئی کئی مہینوں کا ہو، ان کا حکم یہ ہے کہ وہاں اندازہ کر کے مہینے کا اور پھر دن و رات کے اوقات کا تعین کرلیں اور اسی اندازے کے مطابق روزے پورے کریں، علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

" قال في "إمداد الفتاح" قلت: وكذٰلک يقدر لجميع الآجال كالصوم و الزكو ة والحج والعدة وآجال بيع السلم و الإجارة و ينظر ابتداء اليوم فيقدر كل فصل من الفصول الأربعة بحسب ما يكون كل يوم من النقص و الزيادة ، كذا في كتب الأئمة الشافعية ، و نحن نقول بمثله ، إذ أصل التقدير مقول به إجماعاً في الصلوات ". (۲)

ترجمہ: "امداد الفتاح" میں لکھا ہے کہ اسی طرح تمام مدتوں کو اندازے سے مقرر کیا جائے گا، جیسے روزہ، زکاۃ، حج اور عدت کی مدتیں، بیعِ سلم و اجارہ کی مدتیں اور دن کی ابتدا کو دیکھا جائے گا، پھر (سال کی) چار فصلوں اور موسموں میں سے ہر ایک موسم کو دن کے

---

(۱) حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی جانب ہے؛ چناں چہ آپ لکھتے ہیں کہ "اور جہاں بہ قدرِ تحمل نہ ہو، وہاں اندازہ کر کے عدد پورا کریں اور بعدِ ادا اگر ایسے ایام مل جائیں، جس کا تحمل ہو سکے، تو احتیاطاً قضا بھی کرلیں اور اگر ایسے ایام نہ ملیں، تو وہی اندازے کے روزے کافی ہو جائیں گے" (امداد الفتاویٰ:۲/۵۰۵)

(۲) الشامي:۲/۲۳

چھوٹے بڑے ہونے کے حساب سے اندازہ کیا جائے گا۔(مثلاً: گرمی کا دن بڑا ہوتا ہے اور سردی کا چھوٹا) اسی حساب سے مدت مقرر کی جائے گی، شوافع کی کتابوں میں اسی طرح لکھا ہے اور ہم حنفی بھی اسی کے مطابق کہتے ہیں؛ کیوں کہ نمازوں کے بارے میں اندازہ کرنے کی بات سب کے نزدیک کہی گئی ہے۔

اس کی صورت یہ ہے کہ ایسے طویل الاوقات علاقوں سے متصل وہ علاقہ جہاں معمولی اوقات ہیں، وہاں کے حساب سے روزہ وسحری وافطار سب کریں گے، کہ جس دن وہاں روزہ شروع ہوا، اسی کے حساب سے یہاں روزہ رکھ لیں، پھر دن ورات کی تقسیم گھنٹوں کے حساب سے کر کے، یہ دیکھ لیں کہ اس قریبی علاقے میں غروب کے وقت یہاں کتنے بجے ہیں اور سحری کے وقت یہاں کتنے بجے ہیں، اسی کے حساب سے سحری وافطاری کریں۔ (۱)

یہاں بعض علما نے احتیاطاً یہ بھی کہا ہے کہ ایسے طویل الاوقات علاقے میں جہاں ہمیشہ اوقات کا مسئلہ ایسا ہی رہتا ہے، وہاں اوپر کی صورت پر عمل کریں، تو روزے ادا ہو جائیں گے اور اگر بعض موسموں میں ایسا ہوتا ہے اور رمضان ایسے ہی طویل الاوقات دنوں میں آ گیا، تو وہاں کے لوگوں پر اداءِ روزے فرض نہیں؛ بل کہ دوسرے معمولی ایام میں ان کی قضا کر لیں۔ (۲)

اور اگر ان دنوں میں روزہ رکھ لیں، تو پھر احتیاطاً معمولی دنوں میں بھی قضا کر لیں۔ (۳)

---

(۱) اس کے لیے دیکھیے: امداد الفتاویٰ-۱/۵۰۴-۵۰۵

(۲) حضرت تھانوی کی یہی رائے ہے، امداد الفتاویٰ:۱/۵۰۵

(۳) امداد الفتاویٰ:۱/۵۰۵

ایک ملک سے دوسرے ملک کے سفر سے روزے وعید میں فرق

زمانۂ حال نے ہوائی جہاز کے سفر کو جس قدر آسان اور عام کر دیا ہے، اس کے نتیجے میں اب ساری دنیا ایک ملک ہی نہیں، ایک شہر؛ بل کہ گھر و آنگن کا مصداق نظر آتی ہے، اس صورتِ حال نے ایک مسئلہ یہ پیدا کر دیا ہے کہ

۱- ایک شخص ایک دور دراز علاقے مثلاً: سعودی عرب یا امریکہ میں تھا، جہاں رمضان کا چاند مثلاً ہندوستان کے حساب سے ایک یا دو دن پہلے ہوا، اس کے بعد یہ شخص وہاں سے درمیانِ رمضان میں ہندوستان آ گیا، اب یہ شخص اپنے حساب کے مطابق روزے پورے کر لے یا ہندوستان کے حساب کے مطابق سب کے ساتھ روزہ رکھ کر سب کے ساتھ عید کرے؟

اس سلسلے میں قدیم فقہائے کرام کا کوئی کلام نہیں مل سکا؛ البتہ فقہا کے بیان کردہ اس جزیئے سے اس کا حکم مستنبط ہو سکتا ہے کہ اگر کسی نے چاند دیکھا؛ مگر اس کی گواہی اور خبر رد کر دی گئی، تو وہ شخص خود تو روزہ رکھے گا؛ مگر عید سب کے ساتھ کرے گا، اگر چہ ایک دن بڑھ جائے۔ (۱)

اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ اس شخص کو سب کے ساتھ عید کرنا چاہیے اور زائد روزہ بھی رکھنا چاہیے اور حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے شوافع کے ایک قول سے اس کا حکم مستنبط کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

---

(۱) قال أبو البركات النسفي:" ومن رأى هلال رمضان أو الفطر ، و رد قولهٗ صام". (الكنز مع البحر:۲/۴۶۰-۴۸۴)

وفي الدر المختار: [رأى] مكلف [هلال رمضان أو الفطر و رد قوله] بد ليل شرعي [صام] مطلقاً وجوباً ، وقيل: نُدباً. (الدر المختار مع الشامي :۳/۳۵۱)

”ظاہر یہ ہے کہ یہ شخص ہمارے ملک کے لوگوں کی اتباع کرے،
اس کی نظیر شافعیہ کا یہ قول ہے کہ جو شخص ایک شہر میں ظہر کی نماز پڑھ کر،
اس کے فوراً بعد ایک ایسے شہر میں آ گیا، جہاں ابھی ظہر کا وقت نہیں آیا
تھا، تو وہ شخص ان دوسرے شہر والوں کے ساتھ بھی (ظہر کی)
نماز دوبارہ پڑھے گا۔“(۱)

لہٰذا اس شخص کو چاہیے کہ یہاں سب کے ساتھ روزہ رکھے اور سب کے ساتھ عید کرے، خواہ کچھ روزے زیادہ ہو جائیں۔

۲- اسی سے اس کے برعکس صورت کا حکم بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک شخص مثلاً ہندوستان سے ایسے ملک گیا، جہاں دو ایک دن پہلے سے روزے شروع ہو چکے تھے اور وہاں کے لوگوں کے لحاظ سے اس شخص کے روزے کم ہو جائیں، تو اس کے بارے میں ایک سوال یہ ہے کہ جب یہاں کے لوگ اپنے حساب سے عید کریں، تو یہ شخص کیا ان کے ساتھ عید کرے یا نہ کرے؟ اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اس کے روزوں میں جو کمی ہے، اس کا کیا کرے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص کو عید ان ہی لوگوں کے ساتھ کرنا چاہیے؛ کیوں کہ آدمی جس جگہ ہوتا ہے، وہیں کے لوگوں کے ساتھ اس کا صوم و افطار ہوتا ہے۔

حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

«الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والأضحىٰ يوم تضحون.» (۲)

لہٰذا اس شخص کو وہیں کے مسلمانوں کے ساتھ عید کرنا چاہیے اور جو روزوں میں

---

(۱) معارف السنن: ۵/ ۳۳۷

(۲) الترمذي: ۶۹۷، دارقطني: ۲۱۸۱

کمی ہے اس کو قضا کے ذریعے پورا کرنا چاہیے، اگر ایک روزے کی کمی ہے، تو ایک اور دو کی تو دو روزے قضا کرے۔

شیخ العثیمین نے لکھا ہے کہ:

"إذا سافر الرجل من بلد إلىٰ بلد ، اختلف مطلع الهلال فيهما ، فالقاعدة أن يكون صيامهٗ و إفطارهٗ حسب البلد الذي هو فيه حين ثبوت الشهر ؛ لكن إن نقصت أيام صيامهٖ عن تسعة و عشرين يوماً ، فالواجب عليه إكمال تسعة و عشرين يوما لأن الشهر الهلالي لايمكن أن ينقص عن تسعة و عشرين يوما "(۱)

مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمہ اللہ نے "احسن الفتاویٰ" میں اس دوسرے مسئلے میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔(۲)

اس کے بعد "فتاویٰ ابن تیمیہ" دیکھا تو ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی ضمناً بحث کرتے ہوئے، اس مسئلے میں تقریباً یہی لکھا ہے۔(۳)

۳۔ اس سلسلے میں ایک صورت یہ پیش آتی ہے کہ ایک شخص ایک ملک مثلاً سعودی عرب میں عید کر کے چلا اور دوسرے ملک مثلاً ہندوستان پہنچا، تو یہاں اسی

---

(۱) فتاویٰ الشیخ العثیمین: ۶۹۱/۹

(۲) چناں چہ استفتا کیا گیا کہ: مکہ مکرمہ میں پاکستان سے ایک یا دو روز قبل چاند دکھائی دیتا ہے، پس اگر کوئی پاکستان سے مکہ مکرمہ جائے، تو اس کے اٹھائیس ہی روزے ہوئے، اس کا کیا حکم ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ "دوسری صورت میں اہلِ مکہ کے ساتھ عید کرے اور ایک روزہ قضا رکھے"۔ (احسن الفتاویٰ: ۴۳۳/۴)

(۳) مجموعة الفتاویٰ: ۱۰۶/۲۵

دن عید ہورہی ہے،تو کیا کرے؟ ظاہر یہی ہے کہ یہ شخص یہاں کے لوگوں کے ساتھ عید میں شامل ہوجائے۔

۴-اس سلسلہ کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک جگہ سے عید کر کے ایک شخص دوسرے علاقے کو پہنچا اور وہاں ابھی عید نہیں ہوئی تھی ؛ بل کہ رمضان ہی چل رہا تھا، مثلاً: سعودی عرب سے عید کر کے اسی دن ہندوستان یا پاکستان پہنچا اور ہندوستان یا پاکستان میں ابھی انتیسواں ۲۹ روزہ تھا، تو اس شخص کو کیا کرنا چاہیے؟ روزہ رکھنا چاہیے یا نہیں؟ اور یہ کہ دوبارہ یہاں کے لوگوں کے ساتھ عید کرنا چاہیے یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ اس کو اب روزہ رکھنے کی ضرورت نہیں ؛ کیوں کہ اس کے روزے اور عید سب ہو چکے ہیں ، ہاں! یہاں کے لوگوں کے ساتھ اس کو عید میں شامل ہوجانا چاہیے۔[1]

۵- ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص ایک ملک میں رہتے ہوئے انتیس ۲۹ روزے رکھا اور انتیس ۲۹ کی شام میں اعلان ہوا کہ یہاں چاند نہیں ہوا؛ لہٰذا کل کا روزہ ہوگا، یہ شخص اسی رات وہاں سے سفر کر کے دوسرے ملک میں پہنچا، جہاں معلوم ہوا کہ چاند ہوگیا اور صبح عید ہے، اب یہ شخص کیا کرے، یہاں کے لوگوں کے ساتھ عید کرے یا پہلے ملک کے حساب سے روزہ رکھے؟ علامہ عثیمین نے جواب لکھا ہے کہ یہ شخص یہاں کے لوگوں کے ساتھ عید کرے گا اور اگر اس کے روزے یہاں کے حساب سے کم ہیں، تو ان کو قضا کرے گا۔[2]

---

(۱) فتاوی الشیخ العثیمین:۲/۱۹۷

(۲) فتاوی الشیخ العثیمین:۲/۱۹۷

روزے میں انجکشن (Injection) کا حکم

روزے کی حالت میں انجکشن (Injection) کے سلسلے میں اولاً دو باتیں قابلِ غور ہیں:

۱– ایک انجکشن کی صورت کے بارے میں کہ اس کا کیا اثر روزے پر پڑتا ہے؟

۲– دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ انجکشن کس مقصد کے لیے لگایا جارہا ہے؟ اور مقصد کے مختلف ہونے کے لحاظ سے اس کے شرعی حکم میں کیا فرق پڑتا ہے؟

(۱) جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے، اہلِ طب نے بھی یہ بات واضح کردی ہے اور مشاہدہ بھی ہے کہ انجکشن میں سے بعض براہِ راست گوشت میں اور بعض گوشت و پوست کے درمیان میں اور بعض راست طور پر پیٹ میں اور اکثر رگوں میں لگائے جاتے ہیں؛ لہٰذا اب غور یہ کرنا ہوگا کہ ان میں سے کون سے انجکشن کا کیا حکم ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انجکشن خواہ رگوں میں دیا جائے، (جیسے عام بیماریوں کے اندر ہوتا ہے) یا گوشت یا پوست میں لگایا جائے، جیسے ذیابیطس (Dibetics) کے مریضوں کو ''انسولین'' (Insuline) پوست کے اندر لگاتے ہیں۔ یا پیٹ میں لگایا جائے، جیسے کتا کاٹے ہوئے کو پیٹ میں لگاتے ہیں؛ سب کا حکم ایک ہے کہ ان سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

اس مسئلے میں اگرچہ فقہائے معاصرین کے مابین اختلاف واقع ہوا ہے، تاہم جمہور علما کا فتویٰ و فیصلہ یہ ہے کہ اس کا روزہ باقی ہے، فاسد نہیں ہوا۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمان صاحب رحمہ اللہ نے ''فتاویٰ دار العلوم'' میں حضرت

مولانا حکیم الامت اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے ''امداد الفتاویٰ'' میں اور حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اپنے متعدد فتاویٰ اور رسالہ ''آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکام'' اور رسالہ ''كلمة القوم في الإنجكشن في الصوم'' میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔ اسی طرح علمائے عرب میں سے اکثر کی رائے یہی ہے، علامہ شیخ عبداللہ بن باز، شیخ العثیمین، شیخ فوزان رحمہم اللہ وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ فقہا کے کلام سے مفہوم ہوتا ہے کہ روزہ اس وقت ٹوٹتا ہے، جب صورۃً یا معنیً افطار پایا جائے؛ صورۃً افطار یہ ہے کہ منہ سے کوئی چیز نگل کر جوفِ معدہ میں پہنچائی جائے اور معنیً افطار یہ ہے کہ جوف میں ایسی چیز پہنچائی جائے، جس میں بدن کے لیے فائدہ ونفع ہو، خواہ وہ غذا ہو یا دوا ہو؛ پھر جوف تک پہنچانے کی شرط یہ ہے کہ منفذِ اصلی کے ذریعے پہنچائی جائے؛ جب یہ باتیں پائی جائیں، تو روزہ فاسد ہوگا، ورنہ روزہ باقی رہے گا، یہ تفصیل کتبِ فقہ میں موجود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضراتِ فقہا کے مطابق روزہ اس وقت فاسد ہوتا ہے، جب کہ روزے کو توڑنے والی چیز، جوفِ معدہ یا جوفِ دماغ میں پہنچے یا پہنچائی جائے اور یہ پہنچنا یا پہنچانا بھی ''منفذِ اصلی'' کے ذریعے ہو؛ جب یہ دو باتیں پائی جائیں، تو روزہ فاسد ہوگا ورنہ نہیں، یعنی اگر روزے کو توڑنے والی چیز جوفِ معدہ یا جوفِ دماغ میں نہیں گئی یا گئی مگر ''منفذِ اصلی'' کے ذریعے نہیں گئی، تو اس سے روزہ فاسد نہ ہوگا۔

اس اصول پر غور کریں کہ انجکشن میں صورتِ افطار تو نہیں پائی جاتی؛ کیوں کہ انجکشن میں منہ سے دوا نہیں پہنچائی جاتی؛ بل کہ جیسا کہ معلوم ہے رگوں یا گوشت سے دوا داخل کی جاتی ہے، ہاں! انجکشن میں معنیً افطار پائے جاتے ہیں؛ کیوں کہ بدن کے لیے فائدہ مند چیز ''دوا یا غذا'' جوف میں پہنچائی جاتی ہے؛ مگر اس کی جو

شرط ہے کہ یہ پہنچانا ''منفذِ اصلی'' کے ذریعے ہو، یہ بات اس میں متحقق نہیں، اس لیے انجکشن سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

فقہا کے کلام میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ معنیٔ افطار پائے جانے کے باوجود، منفذِ اصلی کے ذریعے جوف میں نہ پہنچنے کی بنا پر اس کو غیر مفسد مانا گیا ہے۔

(۱) فقہا نے روزے میں سرمہ لگانے کی اجازت دی ہے، اگر چہ کہ سرمے کا اثر حلق میں محسوس ہو؛ کیوں کہ یہ سرمہ حلق میں کسی منفذِ اصلی سے نہیں پہنچا؛ بل کہ مسامات سے پہنچا ہے اور آنکھ میں اور معدے یا دماغ کے مابین کوئی منفذ نہیں ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ '' بدائع الصنائع ''میں آنکھوں میں سرمہ ڈالنے کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے، اس کے جواز کی دلیل اس طرح بیان کرتے ہیں:

'' ولأنهٗ لا منفذ من العين إلى الجوف ، ولا إلى الدماغ ، وما وجد من طعمهٖ فذاک أثره ، لا عينهٗ ، وأنهٗ لا يفسد كالغبار والدخان '' . (۱)

اور علامہ شامی رحمہ اللہ سرمہ لگانے کے مسئلے پر وجہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

'' قال في النهر : لأن الموجود في حلقهٖ أثر داخل من المسام الذي هو خلل البدن ، والمفطر أنما هو الداخل من المنافذ ، للاتفاق على أن من اغتسل في ماء فوجد في باطنهٖ أنهٗ لا يفطر . (۲)

---

(۱) بدائع الصنائع :۲/۲۳۷

(۲) الشامي:۳/۳۶۷

ان عبارات سے صاف طور پر معلوم ہوا کہ محض جوف میں کسی چیز کا پہنچ جانا مفسدِ صوم نہیں ہے؛ بل کہ منفذِ اصلی سے پہنچنا مفسدِ صوم ہے، اسی لیے سرمہ اگر چہ آنکھوں میں ڈالنے کے بعد حلق میں محسوس ہو، اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

(۲) فقہا نے روزے کی حالت میں سر میں تیل ڈالنے اور اعضائے بدن پر تیل لگانے کو جائز کہا ہے؛ حال آں کہ اس سے تیل بدن کے اندر پہنچتا ہے اور اس کی تری اندر محسوس بھی کی جاتی ہے؛ مگر چوں کہ ''منفذِ اصلی'' سے نہیں پہنچتا اور اصل و عین چیز نہیں پہنچتی؛ بل کہ اس کا اثر پہنچتا ہے؛ اس لیے اس کو مفسدِ صوم نہیں مانا گیا۔

چناں چہ علامہ کاسانی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

'' و كذا لو دهن رأسهٗ وأعضاءهٗ ، فتشرب فيه أنهٗ لايضرهٗ ؛ لأنهٗ وصل إليه الأثر لاالعين ''(۱)

اور علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'' أو ادَّهنَ لم يفسد صومهٗ ، كما لو اغتسل ووجد برد الماء في كبده أو اكتحل ولو وجد طعمهٗ في حلقهٖ أو لونهٗ في بزاقهٖ أو نخامتهٖ في الأصح ، وهو قول الأكثر ، ....آگے چل کر فرماتے ہیں.....ولو وضع في عينيهٖ لبناً أو دواءً مع الدهن فوجد طعمهٗ في حلقهٖ لا يفسد صومه إذ لا عبرة مما يكون من المسام''. (۲)

(۳) غسل کرنے یا پانی سے بھگویا ہوا کپڑا سر یا بدن پر لپیٹنے سے بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ حال آں کہ اس عمل سے پانی کی ٹھنڈک و تری داخلِ بدن محسوس

(۱) بدائع الصنائع: ۲/۲۳۷

(۲) مراقي الفلاح: ۲۳۶

ہوتی ہے؛ وجہ اس کی بھی یہی ہے کہ اس کا اثر بدن میں جو محسوس کیا جاتا ہے، وہ در اصل مسامات کے ذریعے پہنچتا ہے، کسی منفذِ اصلی سے نہیں پہنچتا۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

” والمفطر أنماهو الداخل من المنافذ، للا تفاق علی أن من اغتسل في ماء ، فوجد في باطنه أنهٗ لا يفطر .“[1]

(۴) فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو پیٹ میں یا سر کے اندر زخم ہو جائے اور وہ اس زخم میں اندر دوا پہنچائے، تو اس سے اس کا روزہ فاسد ہو جائے گا؛ لیکن ان کے علاوہ کسی اور جگہ زخم ہو اور وہاں دوائی لگائی جائے، تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

علامہ نسفی رحمہ اللہ نے ” کنز الدقائق “ میں فرمایا کہ

” داوی جائفة أو آمة بدواء ووصل الدواء الی جوفه أو دماغه أفطر “ .[2]

اس کی وجہ یہی ہے کہ پیٹ کا زخم، جس کو ” جَائِفَة “ کہتے ہیں، اس میں دوا ڈالنے سے وہ جوفِ معدے میں پہنچ جاتی ہے اور سر کے اندر دماغ کے زخم میں دوا ڈالی جائے، تو وہ جوفِ دماغ میں پہنچتی ہے؛ اس لیے اس کو مفسد قرار دیا گیا۔

(۵) مرد کی پیشاب گاہ میں اگر کوئی دوا ٹپکائی جائے اور وہ مثانے تک پہنچ جائے، تو فقہا میں اختلاف ہے کہ اس سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ روزہ فاسد نہ ہوگا اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مثانہ اور

---

(۱) الشامي: ۳/ ۳۶۷

(۲) الکنز مع البحر: ۲/ ۴۸۸

جوفِ بطن میں کوئی منفذِ اصلی ہے یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے؛امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان دونوں میں کوئی راستہ و منفذ نہیں ہے؛ جب کہ امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ ان میں منفذ ہے۔

یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ بات ہر کس و ناکس محسوس کرتا ہے کہ پیشاب معدے ہی سے چل کر مثانے میں آتا ہے،امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے اس سے یہ سمجھا کہ دونوں کے درمیان منفذ ہے؛ اس لیے پیشاب معدے سے مثانے میں آتا ہے؛ مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے کہا کہ نہیں ؛ بل کہ پیشاب کا معدے سے مثانے میں آنا منفذ سے نہیں ؛ بل کہ مسامات سے ہوتا ہے، وہ مسامات سے رس کر مثانے میں جمع ہوتا ہےاوراس کی دلیل یہ ہے کہ پیشاب واپس معدے میں نہیں جا سکتا، اگر وہاں منفذ ہوتا،تو جس طرح آیا تھا اسی طرح واپس بھی جا سکتا؛ مگر ایسا نہیں ہے۔

ابن نجیم مصری نے اسی مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ

" وهو مبني على أنهٗ هل بين المثانة والجوف منفذ أم لا؟ وهو ليس باختلاف فيه على التحقيق ، فقالا: لا! ووصول البول من المعدة إلى المثانة بالترشح ، ومايخرج رشحاً لا يعود رشحاً، كأجرة إذا سُدّ رأسها ، وألقىٰ في الحوض يخرج منها الماء ، ولا يدخل فيها ". (۱)

اورشامی رحمہ اللہ نے کہا کہ

" والاختلاف مبني علىٰ أنهٗ هل بين المثانة والجوف منفذ أو لا؟ وهو ليس باختلاف علىٰ التحقيق والأظهر أنهٗ لا منفذ لهٗ ، وإنما يجتمع البول فيها بالترشح كذا

(۱) البحر الرائق: ۲/۴۸۸

یقول الأطباء ".(۱)

معلوم ہوا کہ اس مسئلے میں اختلاف دراصل جوفِ بطن ومثانے میں منفذ کے ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف پر مبنی ہے، اس سے اتنی بات معلوم ہوگئی کہ اگر امام ابو یوسف رَحِمَہُ اللّٰہُ کے نزدیک بھی یہ بات ثابت ہو جاتی کہ ان دو کے درمیان منفذ نہیں ہے، تو وہ بھی یہی کہتے کہ اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اور امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک یہ محقق ہو جاتا کہ دونوں میں منفذ ہے، تو وہ بھی یہی فرماتے کہ روزہ فاسد ہو جائے گا۔

الغرض ! یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ مخارقِ اصلیہ ومنافذِ اصلیہ سے جو چیز ڈالی جائے اور وہ جوفِ معدہ یا جوفِ دماغ میں پہنچ جائے، وہی مفسدِ صوم ہے؛ بل کہ فقہا کے کلام سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ کسی چیز کے مفسدِ صوم ہونے میں اصل جوفِ معدہ ہے کہ اگر اس میں کوئی چیز پہنچ جائے، تو روزہ فاسد ہوگا اور جوفِ دماغ میں پہنچنے کو اس لیے مفسدِ صوم مانا گیا ہے کہ جوفِ معدہ اور جوفِ دماغ کے مابین بھی منفذِ اصلی موجود ہے؛ لہٰذا جو چیز دماغ میں پہنچے گی، وہ اس منفذ کے ذریعے معدے میں بھی پہنچ جائے گی۔

علامہ ابن نجیم مصری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے کہ

" وفي التحقيق : أن بين الجوفين منفذاً أصلياً، فما وصل إلى جوف الرأس يصل إلى جوف البطن ".(۲)

اور شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اسی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ

---

(۱) الشامي:۳/۳۷۲

(۲) البحر الرائق: ۲/۴۸۸

” قال في البحر: و التحقيق أن بين الجوفين منفذاً أصلياً ، فما وصل إلىٰ جوف الرأس يصل إلىٰ جوف البطن “ .(۱)

الغرض! ان سب سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے کہ محض کسی چیز کے بدن میں پہنچنے یا پہنچانے سے روزہ فاسد نہیں ہوجاتا؛ بل کہ اس وقت فاسد ہوتا ہے، جب کہ دو باتیں پائی جائیں: ایک یہ کہ وہ چیز جوفِ بطن میں پہنچے اور دوسرے یہ کہ ”منفذِ اصلی“ کے ذریعے پہنچے۔

اس سلسلے میں ”بدائع الصنائع “ میں علامہ کاسانی رحمہ اللہ کی ایک عبارت بالکل صاف وواضح ہے، وہ فرماتے ہیں:

” وما وصل إلى الجوف أو الدماغ من المخارق الأصلية ، كالأنف والأذن والدبر بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه ، فوصل إلى الجوف أو الدماغ ، فسد صومهٗ . أما إذا وصل إلى الجوف ، فلا شك فيه لوجود الأكل من حيث الصورة ؛ وكذا إذا وصل إلى الدماغ لأن لهٗ منفذاً إلى الجوف ، فكان بمنزلة زاوية من زوايا الجوف ...... وأما ما وصل إلى الجوف أو الدماغ من غير المخارق الأصلية بأن داوى الجائفة والآمة ، فإن داواها بدواء يابس لا يفسد ؛ لأنه لم يصل إلى الجوف ولا إلى الدماغ ولو علم أنهٗ وصل يفسد في قول أبي حنيفة رحمہ اللہ “. (۲)

---

(۱) الشامي: ۳/۳۷۶

(۲) بدائع الصنائع: ۲/۲۲۷

جب یہ بات معلوم ہو گئی، تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ عام طور پر جو انجکشن لگائے جاتے ہیں، وہ رگوں میں دیے جاتے ہیں اور یہ رگیں، نہ تو جوف ہیں اور نہ منفذِ اصلی؛ اسی طرح گوشت میں یا گوشت و پوست کے درمیان میں جو انجکشن لگائے جاتے ہیں، وہ بھی منفذِ اصلیہ میں نہیں ہے؛ لہٰذا مسئلہ صاف ہو گیا کہ انجکشن سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

اس کے بعد آیئے، انجکشن کے مقصد کے لحاظ سے انجکشن کا حکم معلوم کرتے ہیں:

انجکشن کبھی تو بیماری میں ضرورت کی وجہ سے لیا جاتا ہے، تاکہ اس کے ذریعے دوائی بدن میں پہنچائی جا سکے اور کبھی محض اس لیے لیا جاتا ہے کہ بدن میں قوت و طاقت پیدا ہو اور اس کے لیے غذا پہنچائی جائے؛ مگر روزے کے فاسد ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے اس میں وہی بات ملحوظ رکھنا چاہیے، جو اوپر عرض کی گئی کہ انجکشن منفذِ اصلی سے نہیں دیا جاتا؛ اس لیے انجکشن کی کسی بھی صورت میں اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، خواہ مقصد دوائی ضرورت ہو یا غذائی ضرورت؛ کیوں کہ روزے کے فاسد ہونے کی علت نہیں پائی گئی، جیسا کہ تفصیلاً عرض کیا گیا۔

ہاں! انجکشن لگانے کے مقصد کے پیشِ نظر اس کے جائز ہونے یا مکروہ ہونے میں اختلاف ہو سکتا ہے، کہ بلا ضرورت روزے میں انجکشن لینا مکروہ ہو گا اور ضرورت میں لینا مکروہ نہ ہو گا اور ظاہر ہے کہ دوا تو ضرورت ہے؛ مگر غذا روزے کی حالت میں کوئی ضرورت نہیں؛ بل کہ روزے کی حقیقت کے خلاف ہے؛ لہٰذا اول صورت مکروہ نہیں اور دوسری صورت مکروہ ہو گی۔

اور اس کی فقہی نظیر یہ ہے کہ فقہا نے لکھا ہے کہ ”روزے کی حالت میں اطمینان حاصل کرنے کی غرض سے غسل کرنے، بھیگے ہوئے کپڑے بدن یا سر پر لپیٹنے اور

سر پر پانی ڈالنے کی امام ابو یوسف رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اجازت دی ہے؛ مگر امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کو مکروہ قرار دیا ہے اور مکروہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ روزے میں اس طرح کرنا گویا بے چینی و پریشانی کا اظہار ہے اور یہ بات کراہت سے خالی نہیں''۔

امام شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے کہ

'' وإنما كره الإمام الدخول في الماء والتلفف بالثوب المبلول لما فيها من إظهار الضجر في إقامة العبادة لا لأنهٗ مفطر''. (۱)

اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں: ایک تو یہ کہ روزے میں پانی کا جسم پر یا سر پر ڈالنا، غسل کرنا، جسم پر کپڑا لپیٹنا؛ مفسد و مفطرِ صوم نہیں ۔ دوسرے یہ کہ امام صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کو مکروہ اس لیے کہا ہے کہ اس عمل سے عبادت سے بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اسی طرح جب کوئی بلا ضرورت ایسا انجکشن لیتا ہے، جو غذا فراہم کرتا ہے، تو اس سے بھی اگر چہ کہ روزہ نہیں ٹوٹتا؛ لیکن روزے سے پریشانی و بے چینی کا مظاہرہ ہوتا ہے؛ اس لیے یہ مکروہ ہوگا، اس کے برخلاف دوا کے طور پر انجکشن لینا ایک ضرورت ہے اور اس سے روزہ رکھنے میں سہولت ہوتی ہے اور پریشانی سے حفاظت کا سامان ہوتا ہے؛ اس لیے دوا کے طور پر لینا بلا کراہت جائز ہے، جیسے پانی سے تر کیا ہوا کپڑا سر یا بدن پر لپیٹنا ضرورت پر جائز ہے اور اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اور بعض صحابہ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ سے ثابت ہے۔

---

(۱) الشامي:۳/۳۶۷، البحر الرائق:۲/۴۷۱

علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ" اسی پر فتویٰ ہے"؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے روزے کی حالت میں پیاس کی وجہ سے یا گرمی کی وجہ سے سر پر پانی ڈالا تھا۔اس کو ابوداود نے روایت کیا ہے اور ابن عمر رضی اللہ عنہ روزے کی حالت میں کپڑا بھگو کر اپنے اوپر لپیٹ لیتے تھے۔(۱)

اور علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ

" عن أبي حنيفة رحمه الله أنه يكره للصائم المضمضة والاستنشاق لغير الوضوء ، ولا بأس به للوضوء وكره الاغتسال وصب الماء على الرأس والاستنقاع في الماء والتلفف بالثوب المبلول ؛ لأنه اظهار الضجر عن العبادة .

وقال أبو يوسف رحمه الله : لايكره وهو الأظهر لما روي أن النبي صلى الله عليه وسلم صب على رأسه ماء من شدة الحر وهو صائم ؛ولأن فيه إظهار ضعف بنيته وعجز بشريته ، فإن الإنسان خلق ضعيفاً لا إظهار الضجر". (۲)

---

(۱) الشامي:۳/۴۰۰

(۲)البحر الرائق:۲/۴۹۰

یہاں حضرت اقدس مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ کا "مسئلۂ انجکشن" سے متعلق ایک قیمتی فتویٰ ملا، جو بہت سے شبہات کا جواب بھی ہے اور اس مسئلے کی سیر حاصل بحث بھی، اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے، ملاحظہ ہو:..

....

سوال

میں آپ کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ ایک معاملے میں اپنی تسکین کرلوں اور آپ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاؤں، امید کہ آپ بہ ذاتِ خود تکلیف وتوجہ فرما کر جواب مرحمت فرمائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ ابھی دیو بند کے دارالعلوم سے انگریزی میں ایک رسالہ رمضان المبارک پر شائع ہوا ہے، یہ رسالہ مہتمم جناب قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ کی جانب سے ہے؛ اس لیے اس کی بڑی اہمیت ہے، اس میں لکھا ہے کہ "انجکشن لینے سے روزہ نہیں ٹوٹتا صرف دو استثنا کیے گئے ہیں:

۱- اگر زخم کر کے پانی پیٹ میں لے جایا جائے۔ ۲- براہِ راست دماغ میں دوا لے جائی جائے۔ بقیہ انجکشن کو عمومیت کے ساتھ جائز کہا گیا ہے؛ اس میں مجھے شبہ گذرتا ہے اور خیال ہوتا ہے کہ یہ معاملہ مزید توجہ کا محتاج ہے۔

اسی رسالے میں روزے کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "کھانے پینے اور جماع سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک پرہیز کرنا"۔ ایک زمانے میں کھانے کا طریقہ صرف یہ تھا کہ حلق کے راستے سے کھانا پیٹ میں ڈالا جائے اور پینے کا بھی یہی طریقہ تھا کہ پانی حلق کے راستے سے پیٹ میں ڈالا جائے؛ مگر سائنس کی ترقی نے نئے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں، انہوں نے دریافت کیا کہ کھانا پیٹ میں جا کر کیا کام دیتا ہے، کھانا معدے میں ہضم ہونے کے بعد اس کا جوہر خون بن کر رگوں میں رواں ہوتا ہے۔

لہٰذا ایسے مریضوں کو، جو منہ سے کھا نہیں سکتے، رگوں کے انجکشن کے ذریعے کھانا پہنچایا جاتا ہے؛ بل کہ براہِ راست خون بھی رگوں میں پہنچا دیا جاتا ہے اور عرصے تک اسی طرح مریض کو وہ جوہر رگوں میں پہنچا کر- جو کھانے کا مقصد ہے- بلا کھانا کھلائے رکھا جاتا ہے۔

اسی طرح پانی پینے کا ایک مقصد رگوں کو سیراب کرنا ہے، ایک کافی مقدار پانی کی ہر انسانی جسم میں موجود رہنی ضروری ہے اور اگر وہ موجود نہ رہے، تو انسان مرجائے؛ اس لیے ہیضے کا مرض

پانی کی کمی سے ہوتا ہے، دستوں کے راستے اس کے جسم کا پانی نکل جاتا ہے اور اس کا علاج یہ ہے کہ رگ کاٹ کر پانی براہِ راست رگوں میں بھر دیا جاتا ہے۔ واضح ہو کہ رگ کاٹ کر پانی میں نہیں ڈالا جاتا ہے؛ بل کہ رگوں میں بھرا جاتا ہے، اگر ناک کے ذریعے ٹیوب (Tube) ڈال کر پیٹ میں پانی ڈالا جائے، تو ڈالا جا سکتا ہے؛ مگر معدے میں سوئے ہضم ہے اور جب تک پانی تحلیل ہو کر رگوں کو سیراب کرے گا، مریض ختم ہو جائے گا؛ لٰہذا براہِ راست پانی رگوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔

یہ دو مثالیں میں نے دی ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بعض انجکشن غذا کا، بعض پانی کا مقصد ادا کرتے ہیں، تمثیل کے لیے حسبِ ذیل باتوں پر نگاہ فرمائی جائے۔

(۱) گلوکوز کو ۲۵/۰، ۱۰۰، ۲۰۰، ۵۰۰/سی سی کا رگوں کے ذریعے انجکشن کھانے کا کام دے گا۔

(۲) رگ کو کاٹ کر دو سیر چار سیر پانی براہِ راست رگوں میں بھر دیا جائے، یہ طریقہ پینے کا کام دے گا۔

(۳) رگوں کے ذریعے خون جسم کے اندر ڈال دیا جائے، یہ طریقہ طویل اور پیچیدہ راستے کو ترک کر کے براہِ راست غذا کا مقصد پورا کرتا ہے، یہ سب انجکشن ہیں اور عمومیت کے پیشِ نظر سوال یہ ہے کہ ''کیا یہ سب جائز ہیں اور اگر یہ جائز ہیں، تو ہر آدمی کھانا کھانے کے بہ جائے ۵۰-سی سی گلوکوز انجکشن لے لے، کھانے کا مقصد حل ہو جائے اور بلا روزے کا مقصد پورا کیے روزہ دار کہلائے گا۔

لٰہذا التماس ہے کہ آپ مندرجہ بالا امور پر میری تشفی فرماویں، میں جناب والا کی اس عنایت وکرم فرمائی کا بہت ممنون ہوں گا، والسّلام

الجواب

حامداً ومصلیاً:

روزے کی نقل کردہ تعریف: کھانے، پینے اور جماع سے صبح صادق سے غروب آفتاب تک پرہیز کرنا۔

انجکشن سے (چاہے وہ ۵۰/سی-سی کا یا اس سے کم زائد کا) اس تعریف میں خلل نہیں آتا، کھانا، پینا بدیہی ہے، انجکشن کو کھانا پینا نہیں کہا جاتا، رگ کاٹ کر پانی عروق (رگوں) میں پہنچانے سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے، یعنی رگوں کو تر اور سیراب کرنا، وہ فائدہ گو پورا نہ سہی؛ لیکن کافی مقدار میں ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے میں، غوطہ لگانے، ایرکنڈیشنڈ جگہ میں داخل ہونے، سبز و شاداب مقام پر پہنچ جانے سے بھی حاصل ہوتا ہے؛ سر اور بدن پر تیل کی مالش سے بھی تیل اندر پہنچتا ہے اور رگوں میں تراوٹ پیدا ہوتی ہے، اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ شدتِ گرمی کی وجہ سے کپڑا بھگو کر حالتِ صوم میں سر پر لپیٹنا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، ظاہر ہے کہ مقصد کے خلاف ہے، یونانی اطبا بعض امراض کے علاج میں بھپارہ دیتے ہیں، جس سے مسامات کھل کر دوا کے اثرات اندر داخل ہوتے ہیں اور اکثر مسامات سے ہی پسینے کے راستے امراض باہر آجاتے ہیں اور کبھی مادۂ کثیفہ کو رقیق بنا کر بہ ضرورتِ اسہال یا پلپٹس مادہ خارج کر دیا جاتا ہے۔

غرض کہ جو فائدہ حلق کی راہ سے دوا کو جوفِ معدے میں پہنچانے سے حاصل ہوتا ہے، وہی بھپارہ دینے سے حاصل ہوتا ہے اور یہ طریقۂ علاج طبِ قدیم میں موجود ہے، جدید انکشاف نہیں، فقہا و مجتہدین اس سے خوب واقف ہیں؛ مگر اس کو مفسدِ صوم نہیں قرار دیا، آج سائنس کی ترقی کی وجہ سے اگر ڈاکٹر پر اعتماد کرتے ہوئے اس کا یقین کیا جاتا ہے کہ رگوں کے ذریعے پانی جسم میں پہنچانے سے پینے کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور خون رگوں میں پہنچانے سے کھانے کا مقصد حاصل ہوتا ہے اور بعض مریضوں پر تجربہ اس کا مؤید بھی ہے، تو آج سے چودہ سو سال پہلے صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ سبحان اللہ، الحمد للہ، کھانے کا مقصد حاصل کرنے کے لیے مفید ہے اور جاں نثار پیروی کرنے والوں کو اس کا تجربہ بھی ہے، یہ یقین و اعتقاد بہت زیادہ قوی ہے، سائنس اور ڈاکٹروں کے یقین و اعتماد سے؛ تو کیا اس کو بھی مفسد صوم قرار دیا جائے گا؟

غیبت کو قرآن پاک نے اکل فرمایا ہے:

﴿اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ﴾ (الحجرات:۱۲)

اور بعض کے متعلق تجربۃً قے کرا کے مشاہدہ کرانا بھی حدیث شریف میں مذکور ہے؛ کیا یہ بھی مفسدِ صوم ہے؟

بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ وہاں مشاہدۃً اکل وشرب ہے؛ مگر مقصدِ اکل وشرب اس پر کچھ مرتب نہیں ہوتا، پھر بھی وہ مفسدِ صوم ہے، مثلاً کسی نے ایک تِل کھالیا، اس سے بھوک بھی کچھ بھی دفع نہیں ہوتی؛ مگر روزہ فاسد ہوگیا! اور اگر بھول کر کھا پی لیا، تو حقیقۃً اکل وشرب بھی پایا گیا اور مقصد بھی پورا ہوگیا؛ لیکن روزہ فاسد نہیں ہوا!۔

بعض ایسی صورتیں بھی ہیں کہ جوف میں ایسی چیز داخل ہوگئی، جو اکل وشرب کا فائدہ دینے کے بہ جائے وبال ومصیبت بن گئی؛ مگر روزہ فاسد ہوگیا، مثلاً کسی روزے دار کے تیر مارا گیا اور لوہے کا حصہ اندر رہ گیا تو، روزہ فاسد ہوگیا! سونے میں احتلام سے مقصدِ جماع حاصل ہوگیا؛ مگر روزہ فاسد نہیں ہوا! محض دیکھ کر انزال ہوگیا، روزہ فاسد نہیں ہوا! سفر میں عامۃً مشقت ہوتی ہے، جس کی رعایت سے شریعت نے قصر نماز کا حکم دیا اور اجازتِ افطار دی اور دوسرے بعض احکام میں بھی تخفیفاً سہولت اور رخصت دی اور مسافت سفر تین یوم (تین منزل تقریباً اڑتالیس ۴۸ میل) مقرر کی؛ لیکن اگر کوئی شخص تین دن کی مسافت تین گھنٹے یا اس سے کم میں طے کرے اور بہت راحت کے ساتھ کہ کسی قسم کی مشقت پیش نہ آئے، تو کیا وہ نماز قصر نہیں کرے گا؟ یا اس کو رخصتِ افطار سے محروم کر دیا جائے گا؟ یا دوسرے احکام میں تخفیف کی سہولت ورخصت سے فائدہ نہیں حاصل کر سکے گا؟

اصل یہ ہے کہ قانون پر عمل کی صورت شرعاً تجویز کر دی گئی ہے، اس طرح عمل کیا جائے اور اس پر حکم دیا جائے گا، اس کے خلاف اپنی دوسری صورت تجویز کر کے اپنے تجویز کردہ مقصد قانون کو پورا کیا گیا، تو وہ شرعاً قانون پر عمل نہیں ہوگا اور جو صورت حدودِ قانون کے اندر جائز ہے، اس کو مقصدِ قانون کے خلاف قرار دے کر حدود جواز سے خارج نہیں کیا جائے گا۔

سرکاری قانون ہے کہ لفافے پر ۲۵/ پیسے کا ٹکٹ لگایا جائے، اب اگر کوئی شخص ۲۵/ پیسے کا ٹکٹ نہیں لگاتا؛ بل کہ ۲۵/ پیسے لفافے پر چپکا دیتا ہے، ....

خلاصہ یہ ہے کہ انجکشن اگر ضرورت کے لیے ہے، تو بلا کراہت جائز ہے؛ ورنہ بے چینی کا اظہار ہونے کی وجہ سے کراہت سے خالی نہیں۔

روزے میں دوا کا زبان کے نیچے رکھنا

قلبی امراض میں جو دوائیاں صرف زبان کے نیچے دبانے کی ہوتی ہیں اور حلق کے نیچے اُتاری نہیں جاتیں، ان کا حکم یہ ہے کہ ان سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، اس کی فقہی نظیر ''مسواک کا روزے کی حالت میں استعمال ہے''، جس کو بلا کراہت جائز قرار دیا ہے۔

فقہا نے لکھا ہے کہ

'' ولا بأس للصائم أن يستاك ، سواء كان السواك يابساً أو رطباً ، مبلولاً أو غيرَ مبلول '' . (۱)

نیز اس کی نظیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ'' فقہا نے عورت کو ضرورت کے موقعے پر سالن کے چکھنے کی اجازت دی ہے''، جیسے اس کا شوہر بد خلق ہو، بہ شرطے کہ وہ حلق کے نیچے نہ جائے۔ (۲)

بل کہ ان سب سے زیادہ واضح نظیر، یہ جزئیہ ہے کہ ''فقہا نے عورت کو اپنے بچے

....اس تخیل سے کہ مقصدِ قانون یہ ہے کہ ۲۵/ پیسے حکومت کے لیے خرچ کیے جائیں، سو میں نے ۲۵/ پیسے کر دیے، تو اس کا یہ عمل قانون پر عمل نہیں ہوگا؛ بل کہ کہا جائے گا کہ اس نے قانون میں تحریف و ترمیم کی ہے، جس کا اس کو حق نہیں تھا۔

(فتاویٰ محمودیہ: ۱۵/۱۷۳-۱۷۹)

(۱) بدائع الصنائع :۲/۲۶۶

(۲) مراقي الفلاح:۲۵٦، البحر الرائق:۲/۴۸۹، الدر المختار و الشامي:۳/۳۹۵

کی حفاظت کی خاطر، کھانا چبانے کی بلا کراہت گنجائش دی ہے،" مراقي الفلاح" میں ہے کہ

"وكره مضغة بلاعذر كالمرأة إذا وجدت من يمضغ الطعام لصبيها، أما إذا لم تجد بداً منه فلا بأس بمضغها لصيانة الولد". (۱)

اور "بحر الرائق اور شامی" میں ہے کہ

"والمضغ بعذر بأن لم تجد المرأة من يمضغ لصبيها الطعام من حائض أو نفساء أو غيرهما ممن لايصوم ولم تجد طبيخا". (۲)

جب اپنے بچے کی خاطر کھانا چبانے کی اجازت ہے، تو خود اپنی حفاظت کے لیے ایسی دوا کا استعمال، جو حلق میں نہ جائے، صرف زبان کے نیچے دبا لی جائے جائز ہے؛ لیکن اس میں یہ شرط ہے کہ "اس کا کوئی حصہ حلق میں داخل نہ ہو، ورنہ روزہ یقیناً فاسد ہو جائے گا"۔

روزے میں خون یا گلوکوز (Glucose) چڑھانے کا حکم

یہیں یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ روزے میں خون چڑھانا یا گلوکوز لینا درست ہے یا نہیں اور یہ کہ اس سے روزے پر کیا اثر پڑتا ہے؟

خون یا گلوکوز چڑھانے سے روزے کے ٹوٹنے کا تو سوال پیدا نہیں ہوتا؛ کیوں کہ یہ بھی جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، رگوں کے ذریعے پہنچایا جاتا ہے، منفذِ اصلی

(۱) مراقي الفلاح:۲۵٦

(۲) البحر الرائق:۲/۴۸۹، الشامي:۳/۳۹۵

سے نہیں؛ اس لیے اس سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا؛ بل کہ باقی رہتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ روزے کی حالت میں خون یا گلوکوز لینا درست ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں علما کے کلام سے سمجھ میں آتا ہے کہ

> خون چوں کہ نجس اور حرام ہے اور صرف سخت مجبوری و اضطرار کی حالت میں اس سے انتفاع جائز ہے؛ اس لیے بغیر سخت مجبوری کے اس کا استعمال جائز نہ ہوگا اور پھر ایسا مریض، جس کو مجبوراً خون لینا پڑے عام طور پر روزے سے بھی نہیں رہ سکتا، اس لیے یہ صورت زیادہ تر فرضی ہے۔ غرض یہ کہ اگر کوئی حالتِ مجبوری میں لے لے، تو درست ہوگا، (۱)

اور گلوکوز اگر بہ ضرورت لیا جائے، تو اس کی اجازت ہو سکتی ہے اور اس کی نظیر یہ ہے کہ "فقہا نے روزے کی حالت میں عبادات میں اطمینان حاصل کرنے کے لیے غسل کرنے، بھیگے ہوئے کپڑے بدن یا سر پر لپیٹنے، سر پر پانی ڈالنے وغیرہ کی اجازت دی ہے"۔ (۲)

---

(۱) مثلاً علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ

قال في النهاية والتهذيب : يجوز للعليل شرب البول والدم والميتة للتداوي إذا أخبره طبيب مسلم أن فيه شفاء ولم يجد من المباح ما يقوم مقامهٗ .
(الشامي:۷/۴۸۰)

(۲) وفي الدرالمختار: وكذا لا تكره حجامة وتلفف بثوب مبتل ومضمضة أو استنشاق أو اغتسال للتبرد. (الدر المختار مع الشامي :۳/۳۹۹)

وفي الهندية :كره الاغتسال وصب الماء على الرأس والاستنقاع في الماء والتلفف بالثوب المبلول ، وقال أبويوسف:لا يكره وهو الأظهر،كذا في محيط السرخسي. (الفتاویٰ الهندية:۱/۲۲۰)

اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گرمی یا پیاس کی وجہ سے سر پر پانی ڈالنا ابوداؤد کی روایت سے ثابت ہے۔(۱)

اور یہ معلوم ہے کہ اس سے بدن کے اندر پانی پہنچتا ہے اور اس سے جسم کے اندر ٹھنڈک پہنچ کر پیاس وگرمی ختم ہو جاتی ہے، اس کے باوجود اس کی اجازت فقہا نے دی ہے؛ لہٰذا بہ ضرورت اگر کوئی روزہ دار گلوکوز لے، تو درست ہوگا اور اگر بلاضرورت چڑھائے، تو مکروہ ہوگا؛ کیوں کہ اس میں ایک طرح اس بات کا اظہار ہے کہ وہ روزے سے پریشان ہے اور ایسی کوئی حرکت کرنا، جس سے روزے سے پریشانی و بے چینی ظاہر ہوتی ہو، فقہا نے لکھا ہے کہ مکروہ ہے؛ اسی لیے امام اعظم رحمہ اللہ نے روزہ دار کے لیے ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

چناں چہ علامہ شامی اور ابنِ نجیم رحمہما اللہ فرماتے ہیں:

”وإنما كره الإمام رحمه الله الدخول في الماء والتلفف بالثوب المبلول لما فيها من إظهار الضجر في إقامة العبادة ، لا لأ نهٔ قريب من الإفطار.“(۲)

---

(۱) عن أبي بكر بن عبد الرحمن ، قال : قال الذي حدثني لقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم بالعرج يصب على رأسه الماء وهو صائم من العطش أو من الحر .
(أبو داود:۲۶۹،الرقم،۲۳۶۵۔المستدرک للحاكم:۱/۵۹۷، الرقم،۱۵۷۹۔ السنن الكبرىٰ للبيهقي: ۴/۴۳۸،الرقم،۸۲۶۱)

(۲) البحر الرائق :۲/۴۷۶

قال الشامي:وكرهها أبو حنيفة لما فيها من إظهار الضجر في العبادة .
(رد المحتار : ۳/۳۶۷)

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے (روزہ دار کے لیے) پانی میں اتر
نا اور بھیگے ہوئے کپڑے کو لپیٹنا، اس لیے مکروہ قرار دیا ہے کہ اس میں
عبادت سے بے چینی کا اظہار ہے؛ اس لیے نہیں کہ وہ مفسد ہے۔

ظاہر ہے کہ گلوکوز بلا کسی ضرورت کے چڑھا لینا، اظہارِ بے صبری و بے چینی ہے؛ اس لیے بلا ضرورت یہ مکروہ ہوگا، (واللہ اعلم)۔

روزے میں آپریشن (Operation)

اگر روزہ دار کو آپریشن کرانے کی ضرورت پڑ جائے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپریشن سے روزے پر کیا اثر پڑے گا؟ یاد رکھنا چاہیے کہ محض آپریشن سے تو کسی بھی صورت میں روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ البتہ چوں کہ آپریشن کرنے کے بعد کبھی دوا یا اور کوئی چیز اندر داخل بھی کی جاتی ہے، اس لحاظ سے بعض صورتوں میں روزہ فاسد ہو جائے گا اور بعض صورتوں میں فاسد نہ ہوگا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ

پیٹ یا دماغ کے علاوہ کسی اور جگہ کا آپریشن ہوا ہے، تو دیکھا جائے گا کہ جہاں کا آپریشن ہوا ہے، اس سے پیٹ یا دماغ تک منفذِ اصلی ہے یا نہیں، اگر منفذِ اصلی نہیں ہے، تو اس آپریشن سے روزہ فاسد نہ ہوگا؛ خواہ دوا ڈالی جائے یا نہ ڈالی جائے؛ کیوں کہ جیسا کہ اوپر تفصیل سے گذر چکا ہے کہ وہی چیز روزے کو فاسد کرتی ہے، جو جوف میں پہنچے اور منفذِ اصلی سے پہنچے، جب اس صورت میں جوف تک منفذ ہی نہیں ہے، تو دوا ڈالنے سے بھی وہ جوف تک منفذ کے ذریعے نہ پہنچے گی؛ لہٰذا اس سے روزہ فاسد نہ ہوگا اور محض آپریشن، کسی بھی صورت میں روزے کو فاسد نہیں کرتا۔

اور اگر اس عضو اور جوف کے درمیان کوئی منفذِ اصلی ہے، تو دوا ڈالنے سے روزہ ٹوٹ جائے گا؛ ورنہ نہیں ٹوٹے گا؛ کیوں کہ مفسد پایا گیا۔

اور اگر آپریشن پیٹ یا دماغ کا ہوا ہے، تو دیکھا جائے گا کہ صرف اندر سے کچھ نکالا گیا ہے، یا کوئی دوا بھی اندر ڈالی گئی ہے؛ پہلی صورت پر روزہ باقی ہے اور دوسری صورت پر روزہ فاسد ہو جائے گا۔

اور اگر آپریشن کر کے پیٹ یا دماغ کے جوف میں کوئی مصنوعی یا انسانی یا حیوانی عضو لگایا گیا، تو اس کا حکم حضراتِ فقہا کے یہاں درپیش ایک صورت سے مستنبط ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ:

> اگر کسی شخص کو نیزہ لگا اور جوف تک پہنچ گیا اور جوف ہی میں اس کو رہنے دیا گیا، تو بعض فقہا کے نزدیک اس شخص کا روزہ فاسد ہو جائے گا اور بعض کے نزدیک فاسد نہ ہوگا اور اس سلسلے میں صحیح اسی کو بتایا گیا ہے کہ فاسد نہ ہوگا۔[1]

بالکل یہی صورت اس کی بھی ہے؛ لہٰذا اس میں بھی بہ ظاہر اختلاف ہونا چاہیے اور صحیح قول پر روزہ فاسد نہ ہونا چاہیے؛ مگر ذرا تدبر و تعمق سے کام لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ آپریشن کی زیرِ بحث صورت میں صحیح قول پر فاسد ہونا چاہیے؛ کیوں کہ فقہا کی زیرِ بحث صورت میں روزے کے فاسد نہ ہونے کو اس لیے صحیح قرار دیا گیا ہے کہ

> ''لأنہٗ لم یوجد منه الفعل ، ولم یصل إلیه ما فیه صلاحہٗ''.

> اس روزہ دار کی طرف سے یہ کام نہیں پایا گیا (بل کہ دوسرے نے اس کو نیزہ مارا ہے) اور اس کو ایسی چیز نہیں پہنچی ہے، جو اس کے فائدے کی ہو)۔[2]

---

(۱) بزازیۃ علیٰ ھامش الھندیۃ: ۴/۹۸

(۲) ردالمحتار: ۳/۳۶۸، فتاویٰ قاضي خان علیٰ ھامش الھندیۃ: ۱/۲۰۹

اس سے معلوم ہوا کہ اس صورت میں روزے کو صحیح قول پر فاسد نہ قرار دینا، اس وجہ سے ہے کہ اس میں فاسد ہونے کی وجہ نہیں پائی گئی اور فاسد ہونے کی وجہ دو باتوں میں سے ایک ہے، یا تو فعل خود اس سے صادر ہوا ہو، یا اس چیز میں اس کے بدن کا کوئی فائدہ ہو۔(۱)

اب آپریشن کی زیرِ بحث صورت پر غور کیجیے کہ یہاں روزے کو فاسد کرنے والی ان دو باتوں میں سے کوئی بات پائی جارہی ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ یہاں دونوں باتیں پائی جارہی ہیں: ایک تو وہ شخص خود آپریشن کرانے کو تیار ہو کر گویا یہ فعل خود کررہا ہے اور دوسرے اس میں اس کا بڑا فائدہ بھی ہے؛ لہٰذا زیرِ بحث صورت میں جب کہ آپریشن کر کے کوئی مصنوعی یا حیوانی یا انسانی عضو اندر رکھا جائے گا، روزہ فاسد ہوجائے گا۔ معاصر عالم مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے بھی ''جدید فقہی مسائل'' میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

اور اگر یہ شخص آپریشن کے لیے راضی نہ تھا؛ بل کہ جبراً آپریشن کردیا گیا اور پیٹ یا دماغ کے جوف میں کوئی عضو لگادیا گیا، یا سوتے ہوئے شخص کے ساتھ ایسا معاملہ کیا گیا، تب بھی اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا اور اس کی نظیر فقہ کا یہ جزئیہ ہے کہ

''اگر کسی کے حلق میں کوئی چیز جبراً یا اس کے سونے کی حالت میں داخل کی گئی، تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور صرف قضا لازم ہوگی۔''(۲)

اس کی وجہ علامہ شامی رحمہ اللہ یہ لکھتے ہیں کہ

---

(۱) قال الشامي: ويفسد أيضا فيما لو أوجر مكرهاً أو نائماً. (الشامي: ۳/۳٦۸)

(۲) قال الشامي: وحاصلهٗ أن الإفساد منوط ، إذا كان بفعلهٖ أو فيه صلاح لبدنه. (الشامي: ۳/۳٦۸)

''اس میں اس کا نفع اور فائدہ ہے''۔(۱)

پس معلوم ہوا کہ اوپر روزے کے فاسد ہونے کی جو دو وجہیں بیان ہوئی ہیں، ان میں سے ایک کا پایا جانا کافی ہے؛ لہٰذا اس صورت میں اگر چہ پہلی وجہ تو نہیں ہے؛ لیکن دوسری وجہ تو پائی جارہی ہے؛ لہٰذا روزہ ٹوٹ جائے گا۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ان دونوں آپریشنوں کی صورتوں اور اسی طرح ان صورتوں میں، جن میں دوا ڈالی جاتی ہے اور وہ جوف تک پہنچتی ہے، روزہ جب ٹوٹ جاتا ہے، تو اس پر صرف قضا ہے یا کفارہ بھی ہوگا؟

جواب یہ ہے کہ صرف قضا لازم ہوگی، کفارہ کسی صورت پر بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ کفارہ صرف اس وقت لازم ہوتا ہے؛ جب کہ روزہ صورۃً ومعنیً دونوں طرح توڑ دیا جائے، صورت کے اعتبار سے روزے کا توڑنا یہ ہے کہ منہ سے کوئی چیز نگل لی جائے اور معنیً روزے کا توڑنا یہ ہے کہ بدن میں ایسی چیز داخل کی جائے، جو بدن کے لیے مفید و نفع بخش ہو۔(۲)

اور ان صورتوں میں جیسا کہ ظاہر ہے، صورت کے لحاظ سے افطار نہیں ہوا؛ بل کہ صرف معنے کے لحاظ سے؛ اس لیے ان صورتوں میں صرف قضا لازم ہوگی۔

روزے کی حالت میں بدن سے خون نکالنا

یہ تو ظاہر ہے کہ روزے کی حالت میں بدن سے خون نکالنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ کیوں کہ روزے کو فاسد وہ چیز کرتی ہے، جو بدن میں داخل ہو، نہ کہ وہ جو خارج ہو؛ جیسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے کہ روزے کا ٹوٹ

(۱) قال : لأن فيه صلاحهٗ . (الشامي:۳/ ۳۶۸)

(۲) الشامي:۲/۴۱۰

جانا ان چیزوں سے ہے، جو داخل ہونے والی ہیں، نہ کہ ان سے جو خارج ہونے والی ہیں۔(۱)

نیز حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عکرمہ وابراھیم نخعی سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔(۲)

نیز جمہور علما کا مذہب یہ ہے کہ پچھنا لگوانا روزے کو فاسد نہیں کرتا۔(۳)

لہٰذا خون نکالنے سے روزہ فاسد نہ ہوگا؛ لیکن یہ سوال کہ بہ جائے خود روزہ دار کو ایسا کرنا درست ہے یا نہیں؟ قابلِ غور ہے۔

اگر بہ ضرورت ایسا کرنا پڑے، مثلاً کسی بیمار کے لیے فوری ضرورت پڑ جائے اور یہ خون دے دے، تو اجازت معلوم ہوتی ہے، جیسے علما نے پچھنا لگوانے کی اجازت دی ہے۔(۴)

اور اگر بلا ضرورت کیا جائے، تو کراہت سے خالی نہیں؛ کیوں کہ اس سے بدن میں ضعف اور کمزوری پیدا ہونے کا اندیشہ ہے اور روزہ دار کو ایسا کام کرنا، جس سے کمزوری اور ضعف پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، مکروہ ہے۔(۵)

---

(۱) « عن عائشة رضي الله عنها قالت: دخل رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال: يا عائشة! هل من كسرة ؟ فأتيتهُ بقرص ، فوضعهُ علىٰ فيه وقال: يا عائشة ! هل دخل بطني منه شيء؟ كذلک قبلة الصائم ، إنما الإفطار مما دخل وليس مما خرج . »

(مسندأبويعلىٰ:۸/۲۶۷،الرقم۴۶۰۲،مجمع الزوائد مع بغية :۳/۳۹۰،الرقم :۴۹۷۰)

(۲) دیکھو: فتح الباري :۵/۳۲۶

(۳) قال الحافظ: وأما الحجامة فالجمهور أيضاً على عدم الفطر بها مطلقاً.

(فتح الباری:۵/۳۲۵)

(۴) الدر المختار مع الشامي:۲/۴۱۹

(۵) الدر المختار مع الشامي :۲/۴۲۰،البحر الرائق :۲/۲۷۳

اور ”عالمگیری“ میں لکھا ہے کہ اپنے اوپر اطمینان ہو، تو خون نکالنے میں مضائقہ نہیں؛ ورنہ مکروہ ہے اور کراہت اس وقت ہے کہ ایسا ضعف ہونے کا اندیشہ ہو کہ روزہ توڑنا پڑے۔(۱)

روزہ میں عورت کی شرم گاہ میں لوپ (Loop) داخل کرنا

عارضی مانعِ حمل چیزوں میں سے ایک لوپ (Loop) بھی ہے، جو عورتوں کی شرم گاہ میں چڑھایا جاتا ہے، جس سے اس کے رحم کا منہ بند ہو جاتا ہے، اگر اس کو روزے کی حالت میں فرج (شرم گاہ) میں داخل کیا گیا، تو اس عورت کا روزہ ٹوٹ جائے گا؛ کیوں کہ اس کو فرجِ داخل (شرم گاہ کا اندرونی حصہ) میں داخل کیا جاتا ہے اور فرجِ خارج (شرم گاہ کا بیرونی حصہ، جس کو غسل میں دھونا فرض ہے)، میں اس کا کوئی حصہ نہیں رہتا؛ لہٰذا یہ لوپ جوف تک پہنچ جاتا ہے؛ کیوں کہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے فرجِ داخل کو جوف ہی کا ایک حصہ قرار دیا۔(۲)

پس جب یہ جوف میں پہنچ گیا، تو روزہ جاتا رہا، اس کی نظیر یہ جزئیہ ہے:

”ولو أدخلت قطنة ، إن غابت فسد وإن بقي طرفها في فرجها الخارج لا “.

ترجمہ: اگر عورت روئی داخل کرے اور وہ اندر چلی جائے، تو

(۱) **ولابأس بالحجامة إن أمن علیٰ نفسه الضعف ؛ أما إذا خاف فإنه يكره ......وذكر شيخ الإسلام: شرط الكراهة ضعف يحتاج فيه إلى الفطر .**
(فتاویٰ عالمگیری:۱/۲۲۰)

(۲) **قال: الأقرب التخلص بأن الدبر والفرج الداخل من الجوف إذ لاحاجز بينهما وبينهٗ ، فهما في حكمه .(الشامي:۳/۳۷۲)**

روزہ فاسد ہوگیا اور اگر اس کا حصہ فرجِ خارج میں باقی رہے گا، تو فاسد نہ ہوگا۔(۱)

یہاں چوں کہ لوپ فرجِ داخل میں غائب ہو جاتا ہے اور باہر کے حصے میں کچھ بھی نہیں رہتا؛ اس لیے اس کو داخل کرنے سے روزہ فاسد ہو جائے گا اور اگر روزے کی حالت میں نہیں؛ بل کہ پہلے داخل کر کے پھر روزہ رکھا گیا، تو روزہ فاسد نہ ہوگا، حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ایسا ہی بیان کیا ہے۔(۲)

اور اوپر کی صورت میں صرف قضا لازم آئے گی، کفارہ نہیں، جیسا کہ تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

مانعِ حیض دوائیوں کا رمضان میں استعمال

طب وڈاکٹری کی ترقیات نے جہاں اور بہت سی چیزوں کو ایجاد کیا ہے، وہیں ایسی دوائیوں کو بھی باہر لایا گیا ہے، جو حیض کے خون کو ایک عارضی مدت تک روک دیتی ہیں، ان مانعِ حیض دوائیوں مثلاً (Primolut-N) اور (Duphaston) وغیرہ کے استعمال سے رمضان کے مہینے میں حیض کا خون بند ہو جائے، تو عورت کو اس مدت میں روزہ رکھنا ضروری ہو جائے گا؛ کیوں کہ مدتِ حیض میں عورت کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت؛ بل کہ حکم اس لیے تھا کہ خون جاری ہے، اب جب کہ خون کسی تدبیر سے بند ہو چکا ہے، اس پر روزہ رکھنا اس مدت میں

(۱) الدر المختار مع الشامي:۳/۳۶۹

(۲) چناں چہ آپ لکھتے ہیں کہ :خود روزے کی حالت میں یہ چھلا مفسدِ صوم ہے؛ لیکن اگر غیرِ حالتِ صوم میں ہو، حالتِ صوم میں داخل بدن باقی رہے، تو اس سے روزے میں کوئی خلل نہیں آتا۔ امداد الفتاویٰ:۲/۱۴۴

ضروری ہوگا اور روزے کے شوق سے عورت ان ادویہ کو استعمال میں لاکر اپنا خون بند کرلے، تو اس میں کوئی برائی نہیں؛ بل کہ اچھی بات ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اس زمانے میں جب کہ ایسی دوائیاں ایجاد ہوگئی ہیں، کیا ان دوائیوں کا استعمال رمضان میں عورت پر ضروری ہوگا؛ تاکہ روزہ رکھا جائے؟ جواب یہ ہے کہ ضروری نہیں؛ کیوں کہ اس کے وجوب کی کوئی دلیل نہیں۔

روزے کی حالت میں مصنوعی دانت کا استعمال

مصنوعی دانت اگر روزے کی حالت میں بھی استعمال کیے جائیں، تو ظاہر ہے کہ اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ کیوں کہ اس سے کوئی چیز حلق میں داخل نہیں ہوتی، اسی طرح اس کا استعمال روزے کی حالت میں مکروہ بھی نہیں ہے؛ کیوں کہ اس میں کوئی مزہ یا خوشبو وغیرہ نہیں ہے، جس سے کراہت پیدا ہوجاتی ہے، پھر اس کی جب عادت ہوتی ہے، تو اس کا استعمال ایک ضرورت بھی بن جاتا ہے کہ بغیر اس کے بے چینی اور کلفت محسوس ہوتی ہے؛ اس لیے مصنوعی دانت کا بہ حالتِ روزہ استعمال، بلاکراہت درست ہے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ نے بھی روزے میں اس کے استعمال کو غیر مکروہ قرار دیا ہے۔(۱)

روزے کی حالت میں دانت نکلوانا

روزے کی حالت میں اگر دانت نکلوانے کی حاجت پڑ جائے، تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟ اور اس کا روزے پر کیا اثر ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بلاضرورت ایسا نہ کرنا چاہیے؛ کیوں کہ ایک تو اس سے کمزوری پیدا ہوتی ہے اور روزے

---

(۱) چناں چہ سوال ہوا کہ اگر روزے کی حالت میں یہ مصنوعی دانت منہ میں رہیں، تو روزہ مکروہ تو نہ ہوگا؟ الجواب: مکروہ نہ ہوگا۔ (امداد الفتاویٰ: ۱۴۲/۲)

میں ایسا کام کرنا، جس سے کمزوری پیدا ہو، مکروہ ہے، ''درمختار'' میں ہے کہ

''لا یجوز أن یعمل عملاً یصل بہٖ إلی الضعف''[۱]

یعنی ایسے کام کرنا جائز نہیں، جس سے کہ ضعف کی طرف پہنچے۔

علامہ ابنِ نجیم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے بہ حوالہ '' قنیۃ '' نقل کیا ہے کہ روٹی پکانے کا کام کرنے والے کے لیے جائز نہیں کہ روٹی پکانے میں ایسا منہمک ہو کہ جس سے روزہ توڑنا پڑے۔[۲]

نیز اس موقعے پر منہ میں دوائیاں بھی ڈالی اور لگائی جاتی ہیں، جن کا مزہ محسوس ہوتا ہے اور پہلے یہ بات عرض کر چکا ہوں، کہ جن چیزوں کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے، ان کا بلا ضرورت منہ میں لینا اور چکھنا مکروہ ہے؛ اس لحاظ سے بھی بلاضرورت یہ فعل مکروہ ہوگا۔

رہا یہ سوال کہ اگر دانت نکلوایا، تو روزے پر اس کا کیا اثر ہوگا؟ تو عرض ہے کہ محض دانت نکلوانے سے تو روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ البتہ اس سے خون نکل کر جوف کے اندر چلا جائے اور وہ خون تھوک پر غالب ہو یا اس کے برابر ہو، تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔

درِمختار میں یہ ہے کہ اگر دانتوں کے درمیان میں سے خون نکل کر صرف حلق تک گیا، تو روزہ فاسد نہ ہوگا؛ لیکن اگر جوفِ معدے میں داخل ہو گیا اور وہ تھوک پر غالب یا اس کے برابر ہوا، تو روزہ ''فاسد ہو جائے گا''۔ اسی طرح خون کا مزہ محسوس تھا اور وہ جوف میں داخل ہو گیا، تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔[۳]

---

(۱) الدر المختار مع الشامي :۳/۴۴۰

(۲) البحر الرائق: ۲/۲۸۲

(۳) خرج الدم من بین أسنانہٖ ودخل حلقہٗ ، یعني ولم یصل إلیٰ جوفہٖ ؛ أما إذا وصل فإن غلب الدم أو تساویا فسد ، وإلا، لا ؛ إلا إذا وجد طعمہٗ.

(الدرالمختار مع الشامي:۳/۳۶۷-۳۶۸)

اس پر علامہ شامی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ

''اسی سے اس کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ کسی نے رمضان میں ڈاڑھ نکالا اور خون جوفِ معدے میں داخل ہوگیا، اگر چہ وہ سویا ہوا ہو، تو اس پر قضا لازم ہے'' — مگر علامہ شامی رحمۃ اللہ نے اس کے بعد فرمایا ہے — کہ اوپر والے مسئلے اور اس میں یہ فرق ہوسکتا ہے کہ یہاں احتراز ممکن نہیں اور وہاں ممکن ہے اور اس دوسری صورت کو اس قے پر قیاس کیا ہے، جو خود بہ خود لوٹ جائے کہ یہاں روزہ نہیں ٹوٹتا، ایسے ہی اس مسئلے میں روزہ نہیں ٹوٹنا چاہیے۔[۱]

مگر قے میں اور اس میں فرق ہے، وہ یہ کہ قے غیر اختیاری ہے اور دانت نکلوانا اختیاری؛ لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ اس کے خون کے جوف میں داخل ہونے پر فسادِ روزے کا حکم کیا جائے، صاحبِ ''احسن الفتاویٰ'' اور صاحب ''فتاویٰ رحیمیہ'' نے اسی کو اختیار کیا ہے۔[۲]

روزے میں بیڑی، سگریٹ (Cigarette) حقے کا استعمال

روزے کی حالت میں بیڑی، سگریٹ اور حقے کا استعمال کرنا روزے کو فاسد کر دیتا ہے؛ کیوں کہ ان چیزوں سے دھواں اندر پہنچتا ہے اور دھواں روزے کو فاسد کرنے والی چیز ہے، درِمختار میں ہے:

---

(۱) قال: ومن هذا يعلم حكم من قلع ضرسهٗ في رمضان ودخل الدم إلىٰ جوفهٖ في النهارولو نائماً ، فيجب عليه القضاء ، إلا أن يفرق بعدم إمكان التحرزعنه، فيكون كالقيء الذي عاد بنفسهٖ . (الشامي:۳/۳٦۸)

(۲) احسن الفتاویٰ:۴/۴۳٦ - فتاویٰ رحیمیہ:۳/۱۰۹

" لو أدخل حلقهٗ الدخان أفطر، أيّ دخان كان ، ولو عوداً أو عنبراً !."(۱)

ترجمہ : اگر اپنے حلق میں دھواں داخل کرے گا، تو روزہ ٹوٹ جائے گا، کسی قسم کا دھواں کیوں نہ ہو، اگر چہ عود یا عنبر ہی ہو!۔

اس جگہ علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اسی سے شربِ دخان (جس میں بیڑی، سگریٹ اور حقہ؛ تینوں داخل ہیں) کا حکم بھی معلوم ہوگیا اور اس کو علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ نے نظم کیا ہے (جس کا خلاصہ یہ ہے کہ) ان دخانی چیزوں کے خریدنے اور اس کے پینے سے منع کیا جائے گا اور جو اس کو روزے میں پیے گا، بلا شبہ اس کا روزہ ٹوٹ جائے گا۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ ان سب چیزوں سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ رہا یہ مسئلہ کہ اس سے صرف قضا لازم ہوگی یا کفارہ بھی لازم ہوگا ؟ علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ نے " مراقي الفلاح " میں لکھا ہے کہ اس سے کفارہ واجب ہوگا۔ (۳)

اور علامہ شامی رحمہ اللہ نے بھی ان سے نقل کیا کہ اگر نفع کے خیال سے پیتا ہے، تو کفارہ دینا ہوگا۔ (۴)

---

(۱) الدر المختار مع الشامي:۳/۳۶۶

(۲) فكتب ما نظمهٗ الشرنبلالي: ويمنع من بيع الدخان وشربه ، وشاربهٗ في الصوم لا شک يفطر. (الشامي:۳/۳۶۶)

(۳) قال: لا يبعد لزوم الكفارة أيضا للنفع . (مراقي الفلاح :۲۴۷)

(۴) قال :ويلزمهٗ التكفير،لو ظن نافعاً. (الشامي:۳/۳۶۶)

روزے میں اگربتی، عود وغیرہ کا دھواں سونگھنا

آج کل مساجد میں عام طور پر اگربتی جلانے کا رواج ہے، اسی طرح گھروں میں بھی اس کو استعمال کرتے ہیں اور یہ اچھی چیز ہے؛ مگر رمضان کے مہینے میں دن میں اس کے استعمال سے احتراز کرنا چاہیے؛ کیوں کہ اس کا دھواں بھی اگر حلق میں داخل ہوگیا، تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے، اسی طرح عود وغیرہ کے دھویں کا بھی یہی حکم ہے؛ کیوں کہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ ''دھویں سے بچنا ممکن ہوتے ہوئے، اس سے احتراز نہ کیا گیا، تو روزہ ٹوٹ جائے گا''، درِمختار میں ہے:

'' لو أدخل حلقه الدخان أفطر، أيّ دخان كان ولو عوداً أو عنبراً ، لو ذاكراً لإمكان التحرز عنه ''.(۱)

ترجمہ: اگر اپنے حلق میں دھواں داخل کرے گا، تو روزہ ٹوٹ جائے گا، کسی قسم کا دھواں کیوں نہ ہو، اگر چہ عود یا عنبر ہی ہو؛ کیوں کہ اس سے بچنا ممکن ہے۔

علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اگر بخور جلایا اور اپنے پاس رکھ کر اس کو سونگھا اور روزہ یاد ہے، تو روزہ ٹوٹ جائے گا؛ کیوں کہ اس سے بچنا ممکن ہے، اس میں بہت سے لوگ غفلت کرتے ہے۔'' (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ مساجد و گھروں میں اگربتی و عود وغیرہ جلا کر، اس کا دھواں

---

(۱) الدرالمختار مع الشامي: ۳/۳٦٦

(۲) قال: لو تبخر بخور فآواهُ إلىٰ نفسهٖ واشتمه ذاكراً لصومهٖ أفطر لإمكان التحرز عنه ، وهذا مما يغفل عنه كثير من الناس. (الشامي:۳/۳٦٦)

سونگھنا، روزے کو فاسد کر دیتا ہے اور جیسا کہ علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے فرمایا، اس میں بہت زیادہ کوتاہی و غفلت پائی جاتی ہے؛ خصوصاً مساجد میں دن کے وقت نمازوں کے موقعے پر اگربتی جلا دیتے ہیں، جس کا دھواں بہت سے لوگوں کے حلق میں داخل ہوتا ہے اور معلوم ہو چکا کہ اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ اس لیے اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

موٹروں کا دھواں اور راستے کا غبار

آج کل سڑکیں اور خصوصاً بڑی اور بازار کی سڑکیں، موٹر گاڑیوں سے بھری ہوئی ہوتی ہیں اور ان سے کثیر مقدار میں دھواں خارج ہو کر پوری فضا کو مکدر کرتا رہتا ہے؛ پھر ان موٹروں کے چلنے سے راستے کا غبار بھی پوری فضا کو غبار آلود بنا دیتا ہے، ایسی صورت میں اس دھویں اور غبار کے حلق میں داخل ہو جانے سے کیا روزہ فاسد ہو جاتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر صورتِ حال ایسی ہے کہ اس سے بچنا ممکن ہو، تو اس سے حتیٰ الامکان احتراز کرنا اور اپنے حلق میں اس کو داخل ہونے سے بچانا ضروری ہے اور احتراز ممکن ہوتے ہوئے بچنے کا اہتمام نہ کیا گیا اور یہ غبار اور دھواں حلق میں داخل ہو گیا، تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔

علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ، علامہ شرنبلالی رَحِمَہُ اللّٰہُ کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ

”إذا وجد بداً من تعاطي ما يدخل غباره في حلقه أفسد لو فعل .“[1]

تَرجَمَۃ: جس چیز کا غبار حلق میں داخل ہوتا ہے، اس پر

(۱) الشامي:۳/۳٦٦

قابو پانا ممکن ہو، تو روزہ ٹوٹ جائے گا، اگر ایسا کرے گا (یعنی اگر نہ بچے گا۔

اور اگر صورتِ حال ایسی ہے کہ اس دھویں اور غبار سے بچنا ناممکن ہو، تو اس سے روزہ فاسد نہ ہوگا، درمختار میں اس کی تصریح موجود ہے۔(۱)

اور آج شہروں میں صورتِ حال کچھ ایسی ہی ہے؛ لہٰذا اس سے روزہ فاسد نہ ہو گا، بہ شرطے کہ بچنے کی اپنی بساط بھر کوشش کرلیا ہو اور اسی سے گھروں میں اور بعض فیکٹریوں میں چولہوں سے نکلنے والے دھویں کا حکم معلوم ہوگیا کہ جہاں تک ممکن ہو، وہاں تک بچنا چاہیے، ورنہ روزہ فاسد ہو جائے گا اور بچنا ممکن نہ ہو، تو پھر روزہ فاسد نہ ہوگا۔

روزے میں نسوار (ناس) سونگھنے کا حکم

نسوار جس کو ہمارے علاقوں میں ناس کہا جاتا ہے، اس کو سونگھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؛ چناں چہ حضرت مفتی عزیز الرحمان صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں:

”نسوار شمیدن در انف نیز مفسدِ صوم است۔“

ناک میں ناس سونگھنا بھی روزہ کو فاسد کر دیتا ہے۔(۲)

وجہ اس کی یہ ہے کہ ناس سونگھنے سے ناس ناک کے ذریعے دماغ کے جوف میں پہنچتی ہے اور یہ معلوم ہے کہ جوفِ دماغ تک کسی چیز کا پہنچ جانا روزے کو فاسد کر دیتا ہے؛ البتہ ناس کو ناک میں رکھ کر اس طرح نکال لیا گیا کہ وہ دماغ تک نہیں

(۱) في الدر: [أو دخل حلقه غبار أو ذباب أو دخان] لعدم إمكان التحرز عنه – لم يفطر. (الدر المختار مع الشامي: ۳/۳٦٦)

(۲) فتاویٰ دار العلوم: ٦/ ۴۱۸

پہنچی،تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا؛لیکن ناک میں رکھ کر ایسا نکال لینا کہ ناس کے اجزا دماغ تک نہ پہنچیں، عادۃً دشوار ہے؛ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ اس صورت میں بھی روزے کو فاسد قرار دیا جائے ،حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”نسوار کو ناک میں رکھ کر، اس طرح نکال دیا جائے کہ دماغ تک نہ پہنچے، تو بے شک وہ مفسدِ صوم نہیں؛ لیکن عرفِ عام کے اعتبار سے ایسا ہونا بہت بعید؛ بل کہ عادۃً متعذر رکھا جائے، تو صحیح ہے؛ اس لیے نسوار سونگھنے کو مفسدِ صوم ہی کہا جائے گا“۔(۱)

الغرض! ناس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور اس سے بھی صرف قضا لازم آتی ہے، کفارہ نہیں۔

وکس، امرتجن وغیرہ ادویہ کے استعمال کا حکم

وکس، امرتجن، بام وغیرہ ادویہ کا خارجی استعمال-ظاہر ہے کہ-نہ مفسد ہے، نہ مکروہ؛ بل کہ جائز ہے، اس سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ البتہ ان ادویہ کو ناک میں چڑھانا روزے کو فاسد کر دیتا ہے؛ کیوں کہ یہ دماغ کے جوف تک ناک کے ذریعے پہنچتے ہیں، چناں چہ ”فتاویٰ دار العلوم“ میں ایک سوال و جواب سے اس پر روشنی پڑتی ہے:

سوال: اٹلوس ایک دوا ہے کہ نوشادر اور چونا ملا کر، شیشی بھر کر، ناک سے لگا کر، سونگھا جاتا ہے؛ اس کی تیزی، دماغ تک پہنچتی ہے، اس کے سونگھنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟

---

(۱) امداد المفتین:۴۹۴

الجواب: اس صورت میں روزہ اس کا ٹوٹ جائے گا، قضا لازم ہے۔[1]

اس سے صورتِ مذکورہ بالا کا حکم بھی معلوم ہوگیا کہ اگر ان چیزوں کو ناک میں چڑھایا گیا، تو چوں کہ ان کی تیزی بھی دماغ تک پہنچتی ہے؛ بل کہ خود اس کے اجزا بھی پہنچتے ہے؛ اس لیے روزہ فاسد ہو جائے گا۔

اور اسی سے وکس انہیلر (Vicks inhaler) کے استعمال کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ اس سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے؛ کیوں کہ اس کی تیزی بھی دماغ تک پہنچتی ہے اور صرف قضا لازم آتی ہے۔(واللّٰہ أعلم)

روزے میں انہیلر (Inhaler) کا استعمال

اسی سے ایک اور مسئلہ بھی حل ہوگیا، وہ یہ کہ آج کل ایک آلہ ایجاد ہوا ہے، جس کے بارے میں بہت لوگ کہتے ہیں کہ اس میں ہوا بھری ہوتی ہے؛ مگر صحیح یہ ہے کہ اس میں ہوا کے ساتھ دوا بھی بھری ہوتی ہے، یہ آلہ ''دمے'' کے مریضوں کے لیے بنایا گیا ہے کہ جب اس کو منہ کھول کر دبایا جاتا ہے، تو ہوا کے مانند اس سے کچھ نکلتے محسوس ہوتا ہے اور حلق میں پہنچ جاتا ہے، اس سے دمے کے مریض کو کئی گھنٹے آرام وسکون رہتا ہے؛ اس کے بارے میں سوال ہوتا ہے کہ اس کے استعمال سے روزہ فاسد ہوتا ہے یا نہیں؟

جواب یہی ہے کہ اس سے بھی چوں کہ گیس (Gas) کی شکل کی ایک چیز بدن کے اندر پہنچتی ہے، جس میں دوا ملی ہوتی ہے؛ اس لیے اس سے بھی روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور اس میں چوں کہ صورۃً ومعنیً دونوں طرح افطار پایا جا رہا ہے؛ اس لیے اس میں قضا و کفارہ دونوں لازم ہوں گے؛ جب کہ کفارے کے لازم ہونے کی دوسری

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم: ۶/ ۴۱۸

شرطیں بھی پائی جائیں، مثلاً رات سے روزے کی نیت کی ہو، اس چیز کا استعمال عمداً ہوا ہو، وغیرہ، واللہ أعلم۔(۱)

---

(۱) ایک عالم صاحب نے حضرت اقدس کی خدمت میں اس مسئلے کے تعلق سے اعتراض کیا کہ انہیلر (Inhaler) کے استعمال سے روزہ فاسد نہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ اس سے جو دوا نکلتی ہے، وہ طبی تحقیق کی رو سے پھیپڑوں میں پہنچتی ہے، معدے میں نہیں؛ لہٰذا یہ ایسا ہی ہوا جیسے سانس کے ذریعے خارجی ہوا پھیپڑوں میں ہی پہنچتی ہے، تو جب اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، تو انہیلر کے استعمال سے بھی روزہ فاسد نہ ہونا چاہیے؟

اس لیے مناسب ہے کہ اس مسئلے کی بابت حضرت اقدس کی تحریر کردہ، وہ مفصل تحقیق نذرِ قارئین کردی جائے، جو آپ کے عظیم فقہی و تحقیقی مقالات کے مجموعہ بہ نام ''نفائس الفقہ'' میں درج ہے، اس سے متعلقہ مسئلے کا مناطِ حکم بھی اور آپ کا نقطۂ نظر بھی واضح ہو جائے گا؛ چناں چہ آپ رقم طراز ہیں کہ

''تنفس کی بیماری کے علاج کے لیے ''انہیلر'' کا استعمال درست نہیں، اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ اس سے ایک دوا (بہ صورتِ سفوف جیسا کہ سوال میں ہے یا بہ صورتِ سیال چیز جیسا کہ بعض کا کہنا ہے) ہوا کے ذریعے اندر پہنچائی جاتی ہے اور یہ اگرچہ ڈاکٹروں کے مطابق پھیپڑوں میں پہنچتی ہے، معدے میں نہیں؛ مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس کو اسی راستے سے پہنچایا جاتا ہے، جس سے کہ معدے کی طرف بھی راستہ جاتا ہے اور معدے میں اس کے پہنچنے سے کوئی مانع بھی موجود نہیں ہوتا، اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس کے کچھ اجزا کا پھیپڑوں کے بہ جائے معدے میں چلا جانا عین ممکن ہے؛ لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے روزے کو فاسد قرار دیا جائے، وجہ یہ ہے کہ خود فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ

''إن السبب یقوم مقام المسبب في موضع الاحتیاط''.
(بدائع الصنائع: ۱/ ۲،۱۴۶/ ۳۳۱)

اور یہاں دوا کا بہ ذریعے ''انہیلر'' پھیپڑوں میں پہنچانا سبب ہے، ....

معدے میں پہنچنے کا؛ لہٰذا اس کو بھی مسبب کے درجے میں مان کر روزے کے لیے اس کو مفسد قرار دینا چاہیے۔

اور اسی اصول پر فقہا کے کلام میں احتیاطاً وجوب کی کئی نظیریں ملتی ہیں، مثلاً:

(۱) نوم کا ناقضِ وضو ہونا اسی سبب سے ہے کہ یہ سبب ہے استرخائے مفاصل کا اور وہ سبب ہے خروجِ ریح کا، جو حدَث ہے؛ لہٰذا اس سبب کو مسبب کے قائم قرار دے کر اس کو ناقضِ وضو مانا گیا ہے۔ (بدائع الصنائع:۲/۵۳۵)

(۲) دخول بلا انزال میں وجوبِ غسل کی وجہ بھی یہی ہے کہ عموماً یہ انزال کا سبب ہے؛ لہٰذا اگر چہ انزال نہ ہو؛ مگر دخول ہو جائے، تو غسل کو واجب قرار دیا گیا، فقہا فرماتے ہیں کہ

" لأنہٗ سبب للإنزال ، وھو متغیب عن البصر فقد یخفی علیه لقلتہٖ ، فیقام مقامہٗ لکمال السببیة ."

(الھدایة:۱/۱۹، اللباب فی شرح الکتاب:۱۰، بدائع الصنائع:۱/۱۴۶)

(۳) "ایلاج في الدبر" کی صورت میں مفعول پر وجوبِ غسل کے بارے میں فقہا نے لکھا ہے کہ یہ وجوب احتیاطاً ہے، (الھدایة:۱/۱۹، بدائع:۱/۱۴۶، الشامي:۱/۲۹۹)

(۴) اسی طرح اس شخص پر روزہ واجب قرار دیا گیا، جس نے چاند دیکھا؛ مگر اس کی شہادت قاضی نے رد کر دی، تو یہ شخص روزہ رکھے گا اور اس کی وجہ احتیاط بیان کی گئی ہے۔

(الھدایة :۱/۱۱۷، بحر الرائق:۲/۴۶۴)

الغرض! "انہیلر" اگر چہ پھیپڑوں کے لیے بنایا گیا ہو اور اس سے اصل نشانہ پھیپڑے بنتے ہوں؛ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس سے معدے کو جانے والے راستے ہی سے پھیپڑوں میں یہ دوا پہنچائی جاتی ہے اور معدے میں اس کے اجزا کا چلا جانا بہت ممکن ہے؛ لہٰذا اس کے استعمال سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔

ہاں! چوں کہ ایسا شخص بغیر "انہیلر" کے رہے گا، تو سخت پریشانی کا سامنا کر پڑتا ہے اور بسا اوقات یہ بات اس کے لیے خطرہ بھی بن جاتی ہے؛ اس لیے ایسے شخص کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہوگی اور اگر صحت مل جائے، تو قضا، ورنہ فدیہ ادا کرنا ہوگا۔

روزے میں بھپارے کے ذریعے دوا

بھپارے کے ذریعے دوا کا پہنچانا روزے کو فاسد کردیتا ہے، خواہ وہ پرانے طریقے کے مطابق ہو یا کسی نئے طریقے کے مطابق کسی مشین کے ذریعے ہو اور وجہ ظاہر ہے کہ اس سے بھاپ اور بھاپ کے ذریعے دوائی حلق کے اندر جاتی ہے اور اس کا مفسدِ صوم ہونا معلوم وواضح ہے۔

مقعد میں دوائی یا آلات کا روزے کی حالت میں داخل کرنا

سیال ہو یا جامد، کسی بھی دوا کا مقعد میں داخل کرنا روزے کو فاسد کردیتا ہے؛ خواہ بواسیر کے اندرونی مسوں پر مرہم کی صورت میں ہو یا اور کسی وجہ سے ہو؛ کیوں کہ سُرین ایک منفذ ہے، جس سے راست طور پر جوفِ معدے کو راستہ ہے اور یہ بات واضح ہے کہ جوف میں منفذِ اصلی سے کسی بھی چیز کا داخل کرنا روزے کو فاسد کردیتا ہے؛ اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ ”حقنہ لگانے سے روزہ فاسد ہوجائے گا“ (۱)

اور رہا تشخیص وتحقیق کے لیے مقعد میں آلات کا داخل کرنا، تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، اس کی نظیر فقہا کا بیان کردہ یہ مسئلہ ہے کہ ”اگر کسی نے اپنے مقعد میں لکڑی یا انگلی داخل کی، تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوگا، بہ شرطے کہ لکڑی کا ایک حصہ باہر ہو، پورا اندر داخل نہ ہوجائے اور انگلی خشک ہو، تر نہ ہو۔(۲)

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

”وكذا روي عن محمد رحمه الله في الصائم: إذا

---

(۱) بدائع الصنائع:۲/۲۲۷، الشامي:۳/۳۷۶

(۲) الشامي:۳/۳۶۹

أدخل خشبةً في المقعد ، أنه لا يفسد صومه إلا إذا غاب طرفا الخشبة ، وهذا يدل علىٰ أن استقرار الداخل في الجوف شرط فساد الصوم .''(۱)

اور''عالمگیری''میں ہے:

''ولو أدخل إصبعهٗ في إستهٖ أو المرأة في فرجها لایفسد ، وهو المختار إلا إذا كانت مبتلة بالماء أو الدهن فحينئذ يفسد لوصول الماء أو الدهن .''(۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر مقعد میں کوئی آلہ داخل کیا جائے اور اس میں کوئی دوا یا پانی وغیرہ لگا نا ہو،تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا اور اگر اس پر دوا یا پانی لگا ہو،تو چوں کہ وہ دوا یا پانی اندر رہ جائے گا؛اس لیے اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔

پیشاب کے راستے سے دوا یا کوئی آلہ داخل کرنا

روزے کی حالت میں پیشاب کے راستے سے دوا یا کسی نلکی وآلے کے داخل کرنے کے بارے میں عورت ومرد کا حکم مختلف ہے؛ جہاں تک عورت کا مسئلہ ہے، تو اس کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے کہ عورت کی فرج کے دو حصے ہیں :ایک ''داخل'' دوسری'' خارج''، فرجِ خارج کا حکم یہ ہے کہ اس میں کسی چیز کا داخل کرنا مفسدِ صوم نہیں ؛ کیوں کہ یہ جوف نہیں اور نہ اس میں داخل کی گئی دوا وغیرہ جوف میں جاتی ہے؛اسی لیے اس حصے کو داخلِ بدن نہیں مانا جاتا؛ بل کہ خارج مانا جاتا ہے اور فرجِ داخل اس کے برخلاف ،جوف کا ایک حصہ ہے،علامہ شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے

(۱) بدائع الصنائع:۲/۲۲۷

(۲) عالمگیری : ۱/۲۰۴

لکھا ہے کہ

"قلت : الأقرب التخلص بأن الدبر والفرج الداخل من الجوف، إذ لا حاجز بينهما وبينهٔ ، فهما في حكمه ." (۱)

اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ عورت کی شرم گاہ میں دوا وغیرہ ٹپکانے سے بالاتفاق اس کا روزہ جاتا رہے گا؛ کیوں کہ اس سے جوف میں وہ دوا پہنچ جاتی ہے؛ چناں چہ علامہ کاسانی رحمۃ اللہ نے "بدائع الصنائع" میں فرمایا ہے کہ

" وأما الإقطار في قبل المرأة ، فقد قال مشائخنا: أنهٔ يفسد صومها بالإجماع ؛لأن لمثانتها منفذًا ، فيصل إلى الجوف." (۲)

" البحر الرائق "میں ہے:

" لأن الإقطار في قبل المرأة يفسد الصوم بلاخلاف على الصحيح ." (۳)

اس لیے عورت کی فرجِ داخل میں دوا کا داخل کرنا یا کسی اور چیز، خواہ وہ نلکی ہو یا کسی اور آلے کا داخل کرنا روزے کو فاسد کردیتا ہے، بہ شرطے کہ اس کا کوئی حصہ فرجِ خارج میں نہ رہے، ہاں! اگر اس کا ایک حصہ فرجِ خارج میں یا باہر موجود ہو، تو روزہ فاسد نہ ہوگا۔

اس کی نظیر یہ جزئیہ ہے جو " الدرالمختار " میں لکھا ہے کہ

"ولو أدخلت قطنة ، إن غابت فسد وإن بقي طرفها

---

(۱) الشامي:۳/۳۷۲

(۲) بدائع الصنائع:۲/۲۲۷

(۳) البحر الرائق:۲/۴۸۸

في فرجها الخارج، لا."(١)

اور یہ بات ظاہر ہے کہ دوائیاں جب اندر پہنچانا ہوتا ہے، تو اس کو پوری طرح اندر داخل کر دیا جاتا ہے؛ لہٰذا داخلی فرج میں دوا رکھ دینے سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔ اسی طرح عورتیں جو لوپ (Loop) لگا لیتی ہیں، اس سے بھی روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ یہ بھی فرجِ داخل میں اندر رکھ دیا جاتا ہے؛ لیکن ڈاکٹر لوگ تشخیص وتحقیق کے لیے جو آلات استعمال کرتے ہیں، یہ چوں کہ فرج میں داخل کر کے نکال لیے جاتے ہیں، وہیں چھوڑ نہیں دیے جاتے؛ اس لیے ان سے روزہ فاسد نہیں ہوگا، بہ شرطے کہ ان آلات پر کوئی دوا یا پانی وغیرہ لگا ہوا نہ ہو؛ کیوں کہ اندر داخل کی جانے والی چیز کا جوف ہی میں رہ جانا بھی فسادِ صوم کی شرط ہے۔

علامہ کاسانی رحمہ اللہ نے اسی بات کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"هٰذا يدل علىٰ أن استقرار الداخل في الجوف شرط لفساد الصوم".(٢)

نیز علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

" ويشترط أيضاً استقراره داخل الجوف ، فيفسد إذا غيبها لوجود الفعل مع الاستقرار ، وإن لم يغيبها فلا؛ لعدم الاستقرار."(٣)

معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں کے آلات اگر پانی و دوا لگے ہوئے نہ ہوں، تو ان کے عورت کی شرم گاہ میں داخل کرنے سے اس کا روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

---

(١) الدر المختار:٣/٣٦٩

(٢) بدائع الصنائع:٢/٢٢٧

(٣) الشامي:٣/٣٦٨

اورمرد کی پیشاب گاہ میں کسی چیز کا داخل کرنا اگرصرف ''ذکر'' کی حدتک ہواور مثانے تک نہ پہنچے، تو بالاتفاق اس سے روزہ فاسدنہیں ہوتا۔

شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ

''وأفاد أنهٗ لو بقي في قصبة الذكر لا يفسد اتفاقاً ولا شك فيه.''(۱)

اورعلامہ ابن نجیم المصری رحمہ اللہ نے '' البحرالرائق '' میں ''الخلاصه'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ

''وأما ما دام في قصبة الذكر فلا يفسد اتفاقاً.''(۲)

معلوم ہوا کہ اگر پیشاب کی نالی میں دوایا کوئی آلہ داخل کیا جائے اور وہیں تک محدود ہو، تو اس سے روزہ فاسدنہیں ہوگا اور اگر وہ پیشاب تک نہ پہنچے، تو اس میں اختلاف ہے کہ اس سے روزہ فاسد ہوگا یانہیں ؟ امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ روزہ فاسد نہ ہوگا اورامام ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے روزہ فاسد ہوجائے گا۔

''البحرالرائق'' میں ہے کہ

ترجمۃ: ''وإن أقطر في إحليله لا أي لا يفطر، أطلقه فشمل الماء والدهن، وهذا عندهما خلافاً لأبي يوسف رحمہ اللہ.'' (۳)

اگراپنی پیشاب گاہ کے سوراخ میں قطرہ ڈالا، تو روزہ فاسد نہ ہوگا،

---

(۱) الشامي:۳/۳۷۷

(۲) البحرالرائق:۲/۴۸۸

(۳) البحرالرائق:۲/۴۸۸

قطرے کو مطلق بیان کیا؛ لہٰذا پانی و دوا دونوں کے قطرات کو یہ شامل ہے اور یہ فاسد نہ ہونا، امام ابوحنیفہ وامام محمد رحمہما اللہ کے نزدیک ہے، برخلاف امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے۔

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مثانہ اور جوفِ بطن میں منفذِ اصلی کے پائے جانے کے بارے میں اختلاف ہے، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ ان دونوں میں کوئی راستہ و منفذ نہیں ہے؛ جب کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ان میں منفذ ہے۔

ابن نجیم مصری نے ''البحر الرائق'' میں اسی مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ

''وهو مبني علىٰ أنهٗ بين المثانة والجوف منفذ أم لا ؟ وهو ليس باختلاف فيه على التحقيق، فقالا: لا، و وصول البول من المعدة إلى المثانة بالترشح، ومايخرج رشحاً لايعود رشحاً ، كأجرة إذا سد رأسها، وألقي في الحوض يخرج منها الماء ، ولا يدخل فيها. ''(۱)

اور شامی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ

''والاختلاف مبني علىٰ أنهٗ هل بين المثانة والجوف منفذ أم لا ؟ وهو ليس باختلاف على التحقيق، والأظهر أنه لا منفذ له ، وإنما يجتمع البول فيها بالترشح كذا يقول الأطباء.''(۲)

---

(۱) البحر الرائق:۲/۴۸۸

(۲) الشامي:۳/۳۷۲

معلوم ہوا کہ اس مسئلے میں اختلاف، دراصل جوفِ بطن ومثانے میں منفذ کے ہونے اور نہ ہونے میں اختلاف پر مبنی ہے اور ترجیح امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کو دی گئی ہے؛ علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ

" والأظهر أنهٗ لا منفذ لهٗ وإنما يجتمع البول فيها بالترشح ، كذا يقول الأطباء ". (۱)

ترجمہ: اور زیادہ ظاہر یہ ہے کہ اس کو کوئی منفذ نہیں اور پیشاب مثانے میں رس کر جمع ہوتا ہے، ڈاکٹروں نے ایسا ہی کہا ہے۔

لہٰذا مرد کے پیشاب کے راستے سے کسی دوا یا آلے کا داخل کرنا مفسدِ صوم نہ ہوگا؛ کیوں کہ اس سے جوف میں کوئی چیز نہیں پہنچتی؛ بل کہ وہ جوف سے باہر رہتی ہے۔

روزے میں منجن اور ٹوتھ پیسٹ (Tooth Paste) کا استعمال

منجن اور ٹوتھ پیسٹ کا استعمال روزہ دار کے لیے کراہت سے خالی نہیں، اگر چہ اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ جب کہ یہ حلق میں نہ جائے؛ لیکن چوں کہ اس میں مزہ ہوتا ہے؛ اس لیے عام حالات میں اس کی اجازت نہیں ہوگی؛ بل کہ اس کا استعمال مکروہ ہوگا۔

"ہدایہ" میں ہے کہ

"ومن ذاق شيئاً بفمهٖ لم يفطر، ويكره له ذلك ."

ترجمہ: جو شخص کوئی چیز اپنے منہ سے چکھے، اس کا روزہ نہیں ٹوٹے گا اور یہ بات اس کے لیے مکروہ ہوگی۔ (۲)

---

(۱) الشامي:۳/۳۷۲

(۲) الهداية:۲/۲۶۴

اسی طرح ''البحر الرائق الدر المختار''وغیرہ میں بھی بلا عذر کسی چیز کے چکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔(۱)

اور انہی نصوصِ فقہا کی بنا پر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ نے ''امداد الفتاویٰ''میں منجن کے استعمال کو مکروہ قرار دیا ہے۔(۲)

اس لیے بلا عذر منجن یا ٹوتھ پیسٹ کا استعمال روزے کی حالت میں درست نہ ہوگا؛ البتہ کوئی عذر ایسا ہو، جس میں بغیر اس کے استعمال کے پریشانی ہوتی ہے، تو اس کی اجازت ہوگی؛ چناں چہ مفتی عزیز الرحمان صاحب رحمہ اللہ نے اس عذر کی بنا پر کہ مسوڑھوں سے خون اور مواد نکلتا ہے، منجن کے استعمال کی اجازت دی ہے۔(۳)

حاصل یہ کہ بلا عذر محض دانتوں کی صفائی کے لیے روزے کی حالت میں اس کا استعمال مکروہ ہوگا؛ کیوں کہ دانتوں کی صفائی رات میں بھی ہوسکتی ہے اور کوئی عذر ہوتو؛ البتہ اس کی اجازت ہے؛ مگر احتیاط کرنا ہوگا کہ حلق کے اندر کوئی اس کا جز نہ چلا جائے۔

---

(۱) وكره ذوق شيء ومضغهٔ بلا عذر. (عالمگیری:۱/۲۱۹، الدرالمختار مع الشامي: ۳/۳۹۵، البحرالرائق :۲/۴۸۹،مجمع الأنهر مع ملتقى :۱/۳۶۳، مراقي الفلاح :۲۴۸،بدائع الصنائع:۲/۶۳۵)

(۲) چناں چہ سائل نے اسی مسئلے کی بابت کسی کا اعتراض وتعریض نقل کر کے سوال کیا، تو حضرت رحمہ اللہ نے نصوصِ فقہا ذکر کر کے، جواب دیا کہ

''ان روایات سے واضح ہے کہ یہ فعل مکروہ ہے اور اگر عادۃً جوف کے اندر پہنچ جاوے، تو مفسدِ صوم ہے''۔ (امداد الفتاویٰ:۲/۱۴۱)

(۳) چناں چہ سوال ہوا کہ :جب کہ مسوڑھوں سے خون اور مواد نکلتا ہو، تو کسی ایسے منجن کا جو حابسِ خون اور دافع مواد ہو، استعمال جائز ہے یا نہ؟ جواب: جائز ہے۔ (فتاویٰ دار العلوم:۶/۴۰۳)

روزے میں پرفیوم (Perfume) اور دیگر خوشبوؤں کا استعمال

روزے میں پرفیوم یا دیگر خوشبوؤں کا استعمال، روزے کو فاسد نہیں کرتا اور نہ ہی یہ مکروہ ہے؛ چناں چہ علامہ شامی "امداد الفتاح" کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"لا یکرہ للصائم شم رائحۃ المسک والورد ونحوہ مما لا یکون جوھراً متصلاً کالدخان."(۱)

ترجمہ: روزہ دار کے لیے مشک یا گلاب وغیرہ ایسی چیزوں کی خوشبو سونگھنا مکروہ نہیں ہے، جو جوہرِ متصل نہ ہو، جیسے دھواں۔

البتہ پرفیوم کا استعمال بہ جائے خود اچھی چیز نہیں ہے؛ کیوں کہ جیسا کہ مشہور ہے، اس میں الکحل (Alchohol) ملایا جاتا ہے، جو نجس جوہر "شراب" ہے؛ اس لیے اس سے ہمیشہ ہی احتیاط کرنا چاہیے۔

بے ہوش کرنے اور اعضا کو سُند کرنے کا روزے پر اثر

روزے کی حالت میں بے ہوش کرنے سے یا اعضا کو بے حس وسُند کرنے سے روزے پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے؟ کیا اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے یا نہیں؟ مکروہ ہوتا ہے یا نہیں؟

جہاں تک مسئلہ ہے روزے کی حالت میں "کلوروفارم" یا اسی طرح کی کوئی اور دوا سے جو، حواس کو معطل اور آدمی کو بے ہوش کر دیتی ہے، بے ہوش و بے حس کرنے کا، تو اس کے بارے میں یہ تفصیل ہے، جس سے اس کا روزے پر اثر ظاہر ہوتا ہے۔

بہ ذاتِ خود بے ہوشی کوئی ایسی چیز نہیں ہے، جس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہو؛ بل کہ بے ہوشی و غشی کے طاری ہونے پر بھی روزہ رہتا ہے، فاسد نہیں ہوتا؛ چناں چہ

---

(۱) الدر المختار مع الشامي:۳/۳۹۷

فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ

"ومن أغمي عليه في رمضان ، لم يقض اليوم الذي حدث فيه الإغماء لوجود الصوم فيه ، وهو الإمساك المقرون بالنية".

ترجمہ : جس پر رمضان میں غشی طاری ہوجائے، وہ اس دن کے روزے کی قضا نہ کرے، جس دن کہ اس پر بے ہوشی طاری ہوئی؛ کیوں کہ اس دن کا روزہ پایا گیا اور وہ ہے (کھانے پینے، جماع) سے روکے رہنا نیت کے ساتھ۔(۱)

" **الجوهرة النيرة** " میں بھی اس کو تقریباً انہی الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔(۲)

اور عالمگیری میں ہے کہ:

" ولو أغمي عليه رمضان كلهٗ ، قضاه ؛ وإن أغمي عليه بعد ما غربت الشمس و بقي كذلك أياماً لم يقض تلك الليلة ؛ لأنه إن كان يعلم أنهٗ نوىٰ الصوم فظاهر، و إن لم يعلم فظاهر حاله النية." (۳)

اس میں وضاحت ہے کہ جس شخص پر رمضان میں غشی طاری ہوئی، وہ اس دن کی قضا نہ کرے، جس دن کہ اس پر غشی طاری ہوی؛ کیوں کہ اس کا روزہ ہے؛ البتہ دوسرے دنوں کا روزہ قضا رکھنا ہوگا؛ کیوں کہ ان دنوں بے ہوشی کی وجہ سے اس نے

(۱) الهداية:۲/۲۷۳

(۲) الجوهرة النيرة:۱/۲۰۹

(۳) عالمگیری۱/۲۰۸

نیت نہیں کی اور بغیر نیت کے روزہ نہیں ہوتا،''عالمگیری'' کی عبارت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ افطار کے بعد کسی پر غشی طاری ہو جائے اور اسی حالت پر چند ایام گذر جائیں، تو پہلے دن کا روزہ قضا کرنے کی ضرورت نہیں ؛ کیوں کہ مسلمان سے یہی امید ہے کہ اس نے روزے کی نیت کی ہوگی ؛ لہٰذا روزہ ہوگیا، اگر چہ وہ بے ہوش تھا: اس سے اتنا معلوم ہوگیا کہ ''بہ جائے خود بے ہوشی سے روزہ فاسد نہیں ہوتا''۔

البتہ اس سلسلے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان حواس کو معطل کر دینے والی دواؤں کو کس طرح استعمال کرایا جاتا ہے، اگر ایسی صورت اختیار کی گئی، جس سے دوا بدن کے اندر جوف میں بہ ذریعے منفذِ اصلی پہنچتی ہو، تو روزہ فاسد ہو جائے گا؛ مثلاً ناک کے ذریعے سونگھائی گئی اور اس کی تیزی دماغ تک پہنچی، تو روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر ایسی صورت اختیار کی گئی، جس سے یہ دوا جوف میں نہیں پہنچتی، یا بہ ذریعۂ منفذِ اصلی نہیں پہنچتی، تو روزہ فاسد نہ ہوگا؛ مثلاً انجکشن کے ذریعے یہ دوا دی گئی اور آدمی بے ہوش ہوگیا، تو روزہ نہیں گیا۔ (۱)

جہاں تک مسئلہ ہے اعضا کو سُند و بے حس کرنے کا، تو اس میں عام طور پر انجکشن کے ذریعے دوائی دی جاتی ہے اور جس حصے کو سند کرنا ہوتا ہے، وہیں یہ انجکشن لگایا جاتا ہے، جس سے وہ حصہ کچھ دیر میں بے حس ہو جاتا ہے، اس کا حکم یہ ہے کہ اس صورت میں بھی روزہ فاسد نہیں ہوتا ؛ کیوں کہ جیسا کہ اوپر انجکشن کے مسئلے میں

---

(۱) ''المجمع الفقه الإسلامي، جده'' نے اپنے دسویں سمینار- منعقدہ: ۲۳/ ۲۸ رصفر المظفر ۱۴۱۸ھ- میں اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی ہے، اس میں متعدد چیزوں کو غیر مفسد قرار دیا ہے، ان میں سے ایک یہ لکھا ہے کہ

'' غازات التخدير مالم يعطي المريض سوائل (محاليل) مغذية '' (مجلة المجمع : العدد :۱۰)

وضاحت سے عرض کیا گیا ہے، روزہ اس وقت فاسد ہوتا ہے، جب کوئی مفید چیز جوف میں بذریعۂ منفذِ اصلی پہنچائی جائے اور انجکشن میں منفذِ اصلی سے دوا نہیں جاتی؛ لہٰذا روزہ اس سے فاسد نہیں ہوتا۔

روزے کی حالت میں آنکھوں میں سرمہ یا دوا ڈالنا

عام طور پر کتبِ فقہ میں آنکھوں میں سرمہ یا دوا کے استعمال کو روزہ دار کے لیے درست اور غیر مفسدِ صوم قرار دیا گیا ہے؛ حتیٰ کہ فقہا نے لکھا ہے کہ آنکھوں کے سرمہ اور دوا کا مزہ حلق میں محسوس ہونے لگے، تب بھی روزہ نہیں ٹوٹے گا۔

چناں چہ "البزازیة" میں ہے:

"لا یفسد الاکتحال، ولو وجد طعمهٗ."

ترجمہ: سرمہ لگانا مفسد نہیں، اگر چہ مزہ معلوم ہو۔(۱)

مگر زمانۂ حال کی جدید طبّی تحقیقات نے علما کو اس پر نظرِ ثانی کی زحمت دی ہے؛ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرات فقہائے کرام نے سرمہ اور دوا کے آنکھ میں ڈالنے کو روزے کے لیے جو غیر مفسد قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ اور جوف کے درمیان کوئی منفذِ اصلی نہیں ہے اور جب منفذ نہیں ہے، تو سرمہ یا دوا کے استعمال سے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ یہ منفذ سے جوف تک پہنچیں گے اور یہ ثابت ہے کہ روزے کو فاسد کرنے والی چیز وہی ہے، جو جوف تک پہنچے اور بہ ذریعۂ منفذِ اصلی پہنچے: چناں چہ علما نے جو یہ لکھا ہے کہ آنکھ کے سرمے کا اثر اگر چہ حلق میں محسوس ہو، روزہ اس سے نہیں ٹوٹتا، اس کی وجہ علامہ شامی رحمہ اللہ یہ نقل کرتے ہیں کہ

" لأن الموجود في حلقه أثر داخل من المسام الذي

---

(۱) البزازیة علی هامش الهندیة :۱/۹۷، نیز دیکھو: عالمگیری:۱/۲۰۳

هو خلل البدن ، والمفطر إنما هو الداخل من المنافذ."

ترجمہ : حلق میں جو (سرمہ) موجود ہے، یہ وہ اثر ہے، جو مسامات بدن سے داخل ہوا ہے اور اس روزے کو وہ چیز توڑتی ہے، جو منفذ سے داخل ہو۔(۱)

اس سے اتنا معلوم ہوا کہ حضراتِ علما و فقہا نے آنکھ اور جوف کے درمیان منفذ نہ ہونے کی بنا پر یہ فیصلہ کیا کہ ''آنکھ میں سرمہ ڈالنا مفسدِ صوم نہیں''۔

چناں چہ ''ہدایہ'' میں ہے:

''ولو اكتحل لم يفطر ؛ لانهٔ ليس بين العين و الدماغ منفذ."

ترجمہ : اگر سرمہ لگایا، تو روزہ نہیں ٹوٹا؛ کیوں کہ آنکھ اور دماغ کے درمیان راستہ نہیں۔(۲)

مگر آج کی طبّی تحقیقات نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ آنکھ اور جوف کے درمیان منفذ موجود ہے، اس تحقیق پر یہ مسئلہ کہ ''آنکھ میں دوا ڈالنا یا سرمہ لگانا روزے کو توڑ دیتا ہے یا نہیں؟'' از سرِ نو زیرِ بحث لانے کا محتاج ہو گیا ہے۔

اس سلسلے میں اصولی طور پر دو باتیں ملحوظ ہونی چاہیے:

۱- ایک تو یہ کہ حضراتِ فقہا نے جن مسائل کی بنیادِ علم تشریحِ اعضا پر رکھی ہے، ان میں انھوں نے اپنے زمانے کے ماہرین و محققین کی تحقیقات پر بھروسہ کیا ہے، انھوں نے خود یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان تحقیقات کی بنیاد ہمارے علم پر ہے؛ بل کہ بعض جگہ وضاحت کر دی کہ یہ مسائل فقہ سے متعلق نہیں؛ بل کہ علمِ تشریح سے تعلق

---

(۱) الدر المختار مع الشامي:۳/ ۳۶۷

(۲) الهداية:۲/ ۲۵۵

رکھتے ہیں ، اس سے جو ثبوت ہوگا، اسی پر مسئلۂ شرعیہ کا انطباق ہوگا؛ چناں چہ صاحبِ ''ہدایہ'' نے یہ مسئلہ بیان فرمایا ہے کہ

'' اگر کوئی اپنے ذَکر میں قطرہ ٹپکا لے، تو روزہ فاسد نہ ہوگا - اس کے بعد فرماتے ہیں کہ- یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک مسئلہ ہے اور حضرت ابویوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ روزہ فاسد ہو جائے گا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

''گویا کہ امام ابویوسف رحمہ اللہ کے نزدیک یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ ذکر (پیشاب گاہ) اور جوف کے درمیان منفذ ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ ثابت ہوگیا تھا کہ ان دونوں کے مابین مثانہ حائل ہے اور یہ تحقیق فقہ کے باب سے متعلق نہیں ہے۔''(۱)

اور '' فتاوی خانیہ'' میں ہے:

" لأبي حنيفة رحمہ اللہ أن المثانة ليس لها منفذ ، وإنما يخرج البول منها بطريق الترشح ؛وهذا الكلام يرجع إلى الطب ".(۲)

---

(۱) صاحبِ ہدایہ کی پوری عبارت یہ ہے:

"ولو أقطر في إحليله لم يفطرعند أبي حنيفة رحمہ اللہ وقال أبو يوسف رحمہ اللہ : يفطر. وقول محمد رحمہ اللہ مضطرب فيه ، فكأنهٗ وقع عند أبي يوسف أن بينه وبين الجوف منفذاً ، ولهٰذا يخرج منه البول ، ووقع عند أبي حنيفة أن المثانة بينهما حائل ، و البول يترشح منه ، وهذا ليس من باب الفقه ". (الهداية :۲/۲۶۴)

(۲) فتاوی خانية علیٰ هامش الهندية :۱/۲۱۱

تَرْجَمَۃ : یعنی اس مسئلے میں امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ کی دلیل
یہ ہے کہ مثانے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے اور پیشاب جو نکلتا ہے،
وہ بہ طریقِ ترشح نکلتا ہے اور یہ کلام دراصل طب سے متعلق ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضراتِ فقہانے منفذ ہونے نہ ہونے کی تحقیق کو بابِ فقہ سے نہیں؛ بل کہ علمِ تشریح سے متعلق قرار دیا ہے، جس کو جاننے کے وہ مدعی نہیں؛ بل کہ جس کے پاس جو بات اس علم سے ثابت ہوئی، اس نے اس کے متعلق فتویٰ دیا ہے؛ لہٰذا اس قسم کی جدید تحقیقات پر بھروسہ کرکے مسائلِ فقہ پر غور کرنا درست ہے؛ کیوں کہ فقہانے بھی اس پر اعتماد کیا ہے۔

۲ — دوسری بات یہ ہے کہ جن مسائل کی بنیادِ علم تشریحِ اعضا پر نہیں؛ بل کہ قرآن یا حدیث کی نص پر رکھی گئی ہے، ان میں اگرچہ فقہانے توضیح مطلب وافہام وتفہیم کے لیے اپنے زمانے کی تحقیقات بھی پیش کی ہوں؛ لیکن جدید تحقیقات کی رو سے ان مسائل میں کسی قسم کی ترمیم نہیں کی جاسکتی؛ کیوں کہ یہاں مسئلے کی بنیاد قرآن وحدیث کی نصوص ہیں۔ (۱)

اس اصول پر کہا جائے گا کہ بہ حالتِ روزہ سرمہ لگانا؛ چوں کہ نص سے ثابت ہے؛ لہٰذا سرمہ لگانا مفسدِ صوم نہیں ہے؛ کیوں کہ اس مسئلے کی بنیاد نص ہے، نہ کہ علمِ تشریح کی تحقیقات؛ لہٰذا سرمے کے جواز اور غیر مفسد ہونے میں کسی جدید تحقیق کی بنا پر ترمیم کی گنجائش نہ ہوگی۔

اب رہی یہ بات کہ آنکھ میں سرمہ ڈالنے کا جواز اور اس کا غیر مفسد ہونا کون سی نص سے ثابت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے بعض

---

(۱) حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''امداد الفتاویٰ'' میں ان دونوں اصولوں کی تصریح فرمائی ہے۔
دیکھو: امداد الفتاویٰ، ۲/ ۱۵۸

روایات میں اس کا ثبوت ملتا ہے، جیسے ''بیہقی'' نے روایت کیا ہے کہ

رسول اللہ ﷺ سرمہ لگاتے تھے، اس حال میں کہ آپ ﷺ روزے سے ہوتے۔(۱)

اس حدیث پر محدثین نے نکارت اور ضعف کا حکم لگایا ہے؛ کیوں کہ اس کے ایک راوی ''محمد بن عبید اللہ'' کے بارے میں جرح کی گئی ہے کہ ''منکر الحدیث'' ہیں؛ مگر علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ امام حاکم ابو عبد اللہ رحمہ اللہ نے ان کی توثیق کی ہے۔(۲)

''ناصر الدین البانی'' نے اس حدیث کو ''**صحیح لابن خزیمة**'' کے حوالے سے نقل کر کے اس پر ''ضعف'' کا حکم لگایا ہے اور علامہ ہیثمی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ محمد بن عبید اللہ کی توثیق کی گئی ہے۔(۳)

غرض یہ کہ یہ حدیث صحیح تو نہیں ہے؛ مگر اتنی ضعیف بھی نہیں کہ نا قابلِ احتجاج ہو؛ بل کہ ایک درجے میں قابلِ احتجاج ہے اور پھر بعض اور احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے؛ چناں چہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری آنکھ میں کچھ تکلیف ہے، کیا میں روزے کی حالت میں سرمہ لگا سکتا ہوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں، لگا سکتے ہو۔(۴)

---

(۱) **روى محمد بن عبيد الله عن جده أن النبي ﷺ كان يكتحل بالإثمد وهو صائم.** (البيهقي:۴/۴۳۶، الرقم، ۸۲۵۵)

(۲) **إعلاء السنن :۹/۱۱۷**

(۳) **سلسلة الأحاديث الضعيفة :۴/۴۹**

(۴) **عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: جاء رجل إلى النبي ﷺ، فقال: اشتكت عيني، أفأكتحل وأنا صائم؟ قال: نعم.** (الترمذي:۲/۹۷، الرقم، ۷۲۶)

یہ روایت بھی ضعیف ہے؛ کیوں کہ اس کا راوی ''ابو عاتکہ'' جمہور محدثین کے نزدیک ضعیف ہے، تاہم یہ روایت پہلی روایت کو تقویت دیتی ہے۔ غرض سرمے کے جواز اور غیر مفسد ہونے کی بنیاد طبی تحقیقات نہیں؛ لہٰذا اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ آنکھ اور جوفِ معدے میں کوئی منفذ ہے، تب بھی سرمے کے غیر مفسد ہونے کے حکم میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی اور یہ حکم برقرار رہے گا۔ ہاں! یہ بھی ذہن میں رہے کہ بعض علما کے نزدیک آنکھ میں سرمہ ڈالنا مفسد ہے؛ مگر ان کے اس قول کی بنیاد بھی کوئی طبی تحقیق نہیں؛ بل کہ بعض اور احادیث ہیں، جیسے ابو داود نے روایت کیا ہے کہ اللہ کے رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ روزہ دار سرمہ لگانے سے بچے۔ (۱)

مگر خود امام ابو داؤد رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کو منکر قرار دیا ہے اور علامہ البانی نے بھی اس پر تفصیل سے کلام کر کے اس کو ''منکر'' قرار دیا ہے۔ (۲)

غرض یہ کہ علما نے سرمے کے مفسد ہونے نہ ہونے کا مدار احایث پر رکھا ہے، طبی تحقیق پر نہیں؛ البتہ اگر طبی تحقیق سے یقینی طور پر ثابت ہو جائے کہ آنکھ اور جوفِ معدے میں منفذ ہے، تو دوسری دواؤں وغیرہ کے آنکھ میں ڈالنے کو مفسد قرار دیا جا سکتا ہے؛ مگر شرط یہ ہے کہ یہ نظریہ محض نظریہ نہ ہو؛ بل کہ پایۂ تحقیق کو پہنچ جائے۔ (۳)

---

(۱) عن عبد الرحمن ابن النعمان عن جده عن النبي صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم أنهُ أمر بالإثمد المروَّح عند النوم وقال: لِيَتَّقِهِ الصائم. (ابو داود: ۳/۱۵۶، الرقم، ۲۳۶۹)

(۲) سلسلة الأحاديث الضعيفة: ۳/۷۵

(۳) راقم حقیر نے اس مسئلۂ طبیہ کی تحقیق کے لیے متعدد ڈاکٹروں سے رجوع کیا اور یہ تجویز رکھی کہ اس سلسلے میں ایک سوال مرتب کر کے متعدد طبی سائنسی اداروں کو بھیجا جائے اور سب کے جوابات سامنے رکھ کر کسی نتیجہ پر پہنچا جائے؛ چناں چہ میرے بعض دوست ڈاکٹروں نے بعض اداروں کو سوال نامہ بھیجا؛ مگر افسوس کہ دو سال ہو چکے، کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ (شعیب)

روزے میں آنکھ میں لینس (Lens) لگانا جائز ہے

ایک اہم سوال یہ ہے کہ میں نے آنکھ میں لینس (Lens) لگایا ہے اور اس کو سوتے ہوئے نکال دیا کرتا ہوں اور لینس کو ایک خاص لکویڈ (سیال مادے) میں رکھنا پڑتا ہے، پھر اسی پانی سے اٹھا کر آنکھ میں لگانا پڑتا ہے، اب رمضان قریب ہے، تو سوال یہ ہے کہ ''روزے کی حالت میں لینس آنکھ میں لگانا درست ہے یا نہیں؟''

(سائل: کبیرالدین)

آنکھ میں لینس روزے کی حالت میں داخل کرنا جائز و درست ہے اور جو سیال مادہ اس میں لگا ہوتا ہے، اس کے آنکھ میں جانے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ کیوں کہ فقہا نے لکھا ہے کہ آنکھ میں دوائی ڈالنا جائز ہے، اسی طرح سرمہ لگانا جائز ہے؛ لہٰذا یہ پانی اگر آنکھ میں چلا جائے، تو کوئی حرج نہیں۔

ترکِ روزے میں غیر مسلم یا فاسق ڈاکٹر کے قول پر عمل

جن عذروں کی بنا پر روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، ان میں سے ایک ایسی بیماری بھی ہے، جو روزہ رکھنے سے **کیفاً** یا **کماً** بڑھ جانے والی ہو؛ مگر اس صورت میں روزہ ترک کر دینا، اس وقت جائز ہوتا ہے؛ جب کہ کسی مسلمان متقی ڈاکٹر نے ترکِ روزے کا مشورہ و حکم دیا ہو، جیسا کہ ''درمختار میں'' لکھا ہے کہ وہ ڈاکٹر حاذق، مسلم اور کم از کم عدل نہ ہو، تو مستور ہو کہ فسق ظاہر نہ ہو۔(۱)

---

(۱) وفي الدر: [أو لمريض خاف الزيادة] ......بإخبار طبيب حاذق مسلم مستور [الفطر]. (الدر المختار مع الشامي:۳/۴۰۳-۴۰۴)

وفي البحر : [لمن خاف زيادة المرض]بإخبار طبيب حاذق مسلم غير ظاهر الفسق [الفطر]. (البحر الرائق:۲/۴۹۲)

وفي المراقي: لمن خاف زيادة المرض بإخبار طبيب مسلم حاذق عدل بداء وقال الكمال : مسلم، حاذق، غير ظاهر الفسق، جاز الفطر. (مراقي الفلاح :۲۵۱)

لیکن موجودہ دور میں چوں کہ ڈاکٹر زیادہ تر غیر مسلم یا فاسق ہی ملتے ہیں؛ اس لیے یہ بھی سوال کیا جاتا ہے کہ کیا ایسے حالات میں بھی مسلم وعدل کی قید وشرط لگائی جائے گی، یا غیر مسلم وغیر عدل کے قول پر بھی ترکِ روزے میں اعتماد کیا جا سکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دورِ حاضر میں اگر چہ فسق ظاہر ہے اور عادل و باشرع ڈاکٹروں کا ملنا مشکل ہے؛ مگر ناپید و معدوم نہیں؛ اس لیے ایسی صورت میں احتیاط اسی میں ہے کہ تلاش وجستجو سے کام لے کر باشرع ڈاکٹروں سے مشورہ کیا جائے؛ البتہ اگر کوئی ایسی جگہ ہے، جہاں ایسے ڈاکٹر میسر ہی نہ ہوں، تو وہاں غیر مسلم و غیر عدل ڈاکٹر کے قول پر بھی اعتماد کیا جا سکتا ہے؛ جب کہ وہ اسلام کا احترام کرنے والا ہو، جیسے بعض دیگر صورتوں میں بھی علما نے غیر مسلم ڈاکٹر کے قول پر مجبوری میں عمل کرنے کی اجازت دی ہے، مفتی نظام الدین صاحب رحمہ اللہ اپنے ایک فتوے میں فرماتے ہیں:

> ”بغیر باشرع طبیبِ حاذق کی تشخیص ومشورے کے ممنوعاتِ شرعیہ کو استعمال نہیں کیا جا سکتا، ہاں! اگر کوئی خطہ یا ملک ایسا ہو، جہاں ایسا طبیب میسر ہی نہ آتا ہو، تو وہاں بہ وجہِ مجبوری مطلق طبیبِ حاذق جو مسلمانوں کے مذہب کا احترام اور اس کی رعایت کرتا ہو اور تجربہ اس پر شاہد ہو اور معتمد ومعتبر ہو، خواہ غیر مسلم ہی ہو، اس کی تشخیص پر بھی استعمال کی گنجائش ہو جائے گی۔“(۱)

الغرض! مجبوری میں اس پر عمل کیا جا سکتا ہے؛ ورنہ عام حالت میں یہ شرط کہ ڈاکٹر مسلم ہو اور عدل یا کم از کم مستور ہو، فقہا کے کلام میں بے وجہ نہیں ہے، اس کا بھی لحاظ کرنا چاہیے۔

---

(۱) ماہنامہ دارالعلوم: جلد/۵۳ شمارہ: ۱/۳۷

بہ حالتِ روزہ کانوں میں دوا ڈالنا

کانوں میں کوئی چیز داخل کی جائے، تو روزے کا کیا حکم ہے؟

اس کے بارے میں حضراتِ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر کانوں میں ایسی چیز داخل کی، جس سے صلاحِ بدن متعلق ہے، جیسے دوا یا تیل اور وہ جوف تک پہنچ جائے، تو اس سے روزہ ٹوٹ جائے گا اور اگر ایسی چیز داخل کی، جس سے صلاحِ بدن متعلق نہیں، جیسے ''پانی''، تو روزہ فاسد نہ ہوگا۔ (۱)

نیز دوا یا تیل کان میں داخل ہونے کی صورت میں روزے کے فاسد ہونے کی وجہ یہی بتائی ہے کہ کانوں کے ذریعے یہ دوا یا تیل جو صالح للبدن (بدن کے لیے مفید) ہے اور کسی صالح للبدن چیز کا جوف میں منفذِ اصلی سے پہنچنا، مفسدِ صوم ہے اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر ناک کی دوا یا تیل جوف تک نہ پہنچے، تو روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ ناک میں کوئی خشک دوا ڈالی جائے، تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور اگر سیال دوا ڈالی جائے، تو ٹوٹ جاتا ہے؛ اس کی وجہ یہ ہے کہ عموماً سیال چیز اندر جا کر جوف تک اپنا راستہ بنا لیتی ہے، برخلاف خشک دوا کے کہ وہ جوف تک عموماً نہیں پہنچتی۔

---

(۱) في الهداية: أو أقطر في أذنه أفطر. (الهداية : ۲/۲۶۳)

وفي الدر: أو أقطر في أذنه دُهناً قضیٰ. (الدر المختار مع الشامي: ۳/۳۷۶)

وفي البحر: أو أقطر في أذنه أفطر. (البحر الرائق: ۲/۴۸۷) [والدهن مفسد للصوم ، أما الماء فاختلف في كونه مفسداً للصوم ، فاختار في الهداية عدم الإفطار سواء دخل بنفسه أو أدخلهٔ ، وصححه في المحيط، وفي فتاوی قاضی خان : إن خاض الماء فدخل أذنه لا يفسد ، وإن صب الماء في أذنه فالصحيح أنه يفسد. (كذا في البحر: ۲/۴۸۷، وفي الشامي: ۳/۳۶۷، وفي المراقي: ۲۴۵)

اور اسی پر علامہ شامی رحمہ اللہ نے " فتح القدیر" کے حوالے سے یہ وضاحت نقل کی ہے کہ

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ناک کی دوا جوف تک پہنچے، تو روزہ فاسد ہوگا ورنہ نہیں ؛ لہٰذا اگر خشک دوا کے جوف تک پہنچنے کا یقین ہو جائے، تو اس صورت میں بھی روزہ فاسد ہو جائے گا اور اگر سیال دوا کسی وجہ سے نہ پہنچے تو فاسد نہ ہوگا۔(۱)

اور کان میں پانی داخل ہونے کی صورت میں اختلاف ہے کہ روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟ بعض نے فساد کا قول اختیار کیا ہے اور اس کی وجہ جوفِ دماغ میں پانی کا پہنچنا قرار دیا ہے اور اکثر نے اس صورت میں عدمِ فساد کا قول اختیار کیا ہے اور فاسد نہ ہونے کی بنیاد یہ ہے کہ پانی صالح للبدن نہیں ہے؛ بل کہ کانوں میں اس کا داخل ہونا نقصان دہ ہے؛ لہٰذا نقصان دہ چیز بدن میں داخل ہو اور منہ سے داخل ہو، تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور منہ سے نہ ہو، تو فاسد نہیں ہوتا۔

توضیح اس کی یہ ہے کہ روزہ فاسد ہوتا ہے، دو صورتوں میں:

ایک اس وقت، جب صورت کے لحاظ سے افطار ہو یا اس وقت جب معنے کے لحاظ سے افطار پایا جائے ؛ اگر صورۃً اور معنیً کسی بھی طرح افطار نہ پایا جائے، تو روزہ فاسد نہیں ہوتا اور صورۃً افطار یہ ہے کہ کوئی بھی چیز فطری طریقے سے کھائی جائے ؛ یعنی منہ کے ذریعے جوف میں داخل کی جائے اور معنے کے لحاظ سے افطار یہ ہے کہ کوئی مفید چیز جوف میں داخل ہو؛ لہٰذا اگر بدن میں منہ کے علاوہ کسی اور جگہ

---

(۱) في الدر المختار :(فوصل الدواء حقيقة) قال الشامي: أشار إلى أن ماوقع في ظاهر الرواية من تقييد الخ. (الشامي:۳/۳۷٦)

قال ابن نجيم : لأنهٗ وصل إلى الجوف. (البحر الرائق :۲/۲۷۸)

سے کوئی چیز پہنچائی جائے، تو یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ مفیدِ بدن ہے یا نہیں؟ اگر مفید ہے، تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا اور اگر مفید نہیں ہے، تو روزہ فاسد نہ ہوگا؛ کیوں کہ اس صورت میں صورت کے لحاظ سے بھی افطار نہیں پایا گیا اور معنے کے لحاظ سے بھی نہیں پایا گیا؛ پس کان میں دوا ڈالنے سے روزہ فاسد ہو جائے گا کہ یہ مفیدِ بدن ہونے کی وجہ سے معنیً افطار ہے اور پانی سے فاسد نہ ہوگا؛ کیوں کہ یہ فطری طریقے پر کھانا نہ ہونے کی وجہ سے صورۃً افطار بھی نہ ہوا اور مفیدِ بدن نہ ہونے کی وجہ سے معنیً بھی افطار نہیں ہوا۔(۱)

الحاصل! کان اور جوفِ معدہ و جوفِ دماغ کے مابین منفذ ہونے کی وجہ سے، فقہا نے کان میں دوا و تیل ڈالنے کو مفسدِ صوم قرار دیا ہے؛ بہ شرطے کہ اس کا جوف تک پہنچنا یقینی ہو؛ مگر اب جدید تحقیقات کے حوالے سے ڈاکٹروں نے بتایا ہے کہ کان اور دماغ اور معدے کے مابین کوئی منفذ نہیں ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، حضراتِ فقہائے کرام نے اپنے زمانے کی تحقیقات کے مطابق، ان مسائل میں حکمِ شرعی بیان کیا ہے؛ اگر ان کے سامنے اس کے خلاف دوسری تحقیق ہوتی، تو دوسرا حکم بیان فرماتے؛ لہٰذا اگر جدید تحقیقات پوری طرح تسلی و اطمینان کر دیں کہ کان و معدے و دماغ کے درمیان کوئی راستہ نہیں ہے اور ان کے درمیان پردہ حائل ہے، جس کی وجہ سے کوئی چیز کان کے ذریعے جوف تک نہیں پہنچتی، تو پھر کہا جائے گا کہ کان میں دوا وغیرہ ڈالنے سے روزہ فاسد نہ ہوگا؛ البتہ پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو مفسدِ صوم قرار دیا جائے، جیسے فقہا نے بعض اور مسائل میں احتیاط کی وجہ سے حکم لگایا ہے۔

---

(۱) دیکھو: مراقي الفلاح: ۲۵۲

روزے میں (NEBULIZER-PUMP) کا استعمال

آستما (ASTHMA) کے بیماروں کے لیے ایک پمپ تیار کیا گیا ہے، جس کو (NEBULIZER-PUMP) کہا جاتا ہے،اس پمپ کو دبانے سے منہ کے ذریعے دَوا، جو دھویں کی شکل میں ہوتی ہے، پھیپڑوں میں پہنچتی ہے اور مریض فوری طور پر راحت محسوس کرتا ہے ،اسی طرح بعض اور اسپرے (SPRAY) اس بیماری کے لیے ایجاد ہو چکے ہیں۔

ان کے استعمال سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں علمائے معاصرین میں اختلاف ہوا ہے،بعض حضرات، جیسے ''شیخ عبدالعزیز بن باز''، ''شیخ العثیمین''، ''شیخ ابن جبرین'' وغیرہ نے اس کو غیر مفسد قرار دیا ہے اور بعض حضرات نے اس کو مفسد قرار دیا ہے۔

جو حضرات اس کو غیر مفسد کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اس آلے میں کل دس ملی لیٹر سیال دوا ہوتی ہے اور اس مقدار کو دو سو مرتبہ اسپرے کیا جا سکتا ہے،تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک مرتبہ میں ایک انتہائی قلیل مقدار اس سے آدمی کے منہ میں داخل ہوتی ہے اور یہ مقدار اولاً تو حلق میں اور وہاں سے جوف میں داخل نہیں ہو سکتی اور اگر داخل بھی ہوئی ،تو اس قدر قلیل مقدار کو مفسد نہیں کہا جائے گا۔ (۱)

اور جو حضرات اس کو مفسد کہتے ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ اس پمپ کے ذریعے دوا جوف کے اندر پہنچتی ہے، اگر چہ کہ وہ مقدار کے لحاظ سے بہت کم ہی کیوں نہ ہو اور روزے کے فاسد ہونے میں کم یا زیادہ مقدار کا کوئی فرق نہیں ہے، ایک چیز اگر زیادہ مقدار میں مفسد ہے،تو وہ کم مقدار میں بھی مفسد ہے؛ لہٰذا اس سے روزہ فاسد ہو جائے

---

(۱) دیکھو: المفطرات المعاصرۃ ، للشیخ خالد بن علی المشیقح

گا،اس پر ہم نے اوپر ''انہیلر'' (Inhaler) کے مسئلے میں بحث کر دی ہے۔

ہاں! جو مریض اس کے بغیر رہ نہیں سکتا اور بیماری کے شدید ہونے کا خطرہ ہو، یا شدید تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہو،تو اس کو اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھے اور جب طبیعت ٹھیک ہو جائے ،تو قضا کرے یا اگر اس کا بھی امکان نہ ہو،تو پھر فدیہ دے دے۔

گیس (GAS) سے روزے پر اثر

آج کل گیس (GAS) کا استعمال عام ہو گیا ہے، پکوان کے لیے بھی اور روشنی کے لیے بھی، یہ گیس سلنڈروں میں بھری ہوتی ہے اور کبھی کسی غلطی یا خرابی کی وجہ سے خارج ہونے لگتی ہے اور اس کی بو سے اس کو ہر کوئی محسوس بھی کر سکتا ہے، روزے کی حالت میں اگر یہ گیس منہ یا ناک کے ذریعے حلق میں داخل ہو جائے ،تو کیا روزہ فاسد ہو جائے گا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ گیس خواہ بالقصد یا بلا قصد منہ سے یا ناک سے اندر داخل ہو جائے ،تو روزہ فاسد نہ ہو گا؛ کیوں کہ گیس ایک ہوا ہے اور ہوا کے اندر داخل ہونے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ اسی لیے کسی خوشبو یا بدبو کے سونگھنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

اس کتاب کی سابقہ اشاعت میں احقر نے گیس کو دھویں پر قیاس کرتے ہوئے یہ لکھا تھا کہ ''بلا قصد اگر یہ اندر چلا جائے ،تو روزہ فاسد نہ ہوگا؛ لیکن اگر بالقصد داخل ہوا،تو روزہ فاسد ہو جائے گا اور لکھا تھا کہ اس کی نظیر فقہا کا بیان کردہ یہ مسئلہ ہے کہ اگر گرد و غبار یا دھواں خود بہ خود بلا قصد کے حلق میں چلا جائے ،تو روزہ فاسد نہ ہوگا اور اگر بالقصد داخل کیا،تو روزہ فاسد ہو جائے گا اور اس مسئلے کی علت یہی بیان کی ہے کہ گرد و غبار اور دھویں سے بچنا ممکن نہیں ہے اور جس صورت میں ممکن ہے، وہاں

بالقصد داخل کرنا مفسدِ صوم ہے، گیس کی صورت بھی تقریباً ایسی ہی ہے؛ لہٰذا بلا قصد داخل ہو جائے، تو روزہ فاسد نہ ہوگا اور اگر بچنا ممکن ہو اور پھر بھی بچنے کی کوشش نہ کر کے گیس حلق میں داخل کر لیا، تو روزہ فاسد ہو جائے گا۔"

لیکن اب میں اس سے رجوع کرتا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ اس کو دھویں کے بہ جائے ہوا پر قیاس کرنا اقرب ہے؛ لہٰذا گیس سے کسی بھی صورت میں روزہ فاسد نہیں ہوتا۔

روزے میں دوائی غرغرہ کرنے کا حکم

روزے کی حالت میں اگر کسی ضرورت مند کو دوائی غرغرہ کرنا پڑے، مثلاً حلق یا گلے میں سخت تکلیف ہے اور ڈاکٹر نے اس کو دوا دی کہ اس سے غرغرہ کیا جائے، تو کیا روزے کی حالت میں اس کا استعمال جائز ہے؟ اور کیا اس سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ضرورتِ شدیدہ میں اس کا ستعمال کیا جائے، تو اس کی گنجائش ہے؛ مگر سخت احتیاط کرنا ہوگا کہ کہیں حلق کے نیچے یہ دوائی نہ چلی جائے، اگر حلق کے نیچے چلی گئی، تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔ وھو ظاھرٌ

علامہ شیخ العثیمین سے سوال کیا گیا کہ

" **هل يبطل الصوم باستعمال دواء الغرغرة ؟** "

تو جواب لکھا کہ

" **لا يبطل الصوم إذا لم تبتلعه ، ولكن لا تفعله إلا إذا دعت الحاجة ولا تفطره إذا لم يدخل جوفك شيء منه** " (۱)

روزے میں آکسیجن (OXYGEN)

روزے کی حالت میں آکسیجن دینے سے روزہ باقی رہتا ہے یا فاسد ہو جائے گا؟

---

(۱) فتاویٰ الشیخ العثیمین: ۱۹/۲۹۰

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا، جیسے اور قسم کے گیس (GAS) کے اندر داخل ہونے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ کیوں کہ آکسیجن ایک ہوا ہے اور اس سے روزہ فاسد نہ ہوگا، یہ اس صورت میں ہے، جب کہ آکسیجن میں کوئی اور چیز دوا وغیرہ کی ملاوٹ نہ ہوتی ہو اور اگر اس کے ساتھ کوئی چیز ملائی جاتی ہو (جس کی احقر کو تحقیق نہیں ہوسکی) تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا اور اس صورت میں اس شخص پر، جس کو روزے میں آکسیجن دیا جائے، بعد میں اس کی قضا کرنا لازم ہوگا، کفارہ نہیں۔(۱)

اس مسئلے میں کتاب کے سابقہ اڈیشن میں، آکسیجن سے روزے کے فاسد ہونے کا حکم لکھا گیا تھا اور اس کی بنیاد یہی تھی کہ آکسیجن میں دوائیاں ملائی جاتی ہیں؛ لیکن بعد میں جب معلومات کی گئیں، تو اس مسئلے میں دو قسم کی باتیں ڈاکٹروں سے معلوم ہوئیں؛ لہٰذا اب دونوں شقوں کے لحاظ سے مسئلہ لکھا گیا ہے۔

طباخ کو روزے کی حالت میں سالن وغیرہ چکھنا

ہوٹلوں میں اور فیکٹریوں وغیرہ میں جو لوگ پکانے کا کام کرتے ہیں، ان کو روزانہ اس کی ضرورت پڑتی ہے کہ کھانا اور سالن وغیرہ کو چکھ کر دیکھا جائے، فقہائے کرام نے اس عورت کو، جس کا شوہر بدمزاج ہو اور اس غلام کو، جس کا آقا ظالم ہو؛ اس بات کی اجازت دی ہے کہ وہ روزے میں سالن وغیرہ چکھ کر دیکھ لے۔(۲)

---

(۱) لأنہ مضطر فلا کفارۃ علیہ ، کما في المراقي:۲۴۱

(۲) قال: الذوق بعذر لا یکرہ ؛کما في الخانیۃ فیمن کان زوجھا سيء الخلق أو سیدھا لابأس بأن تذوق بلسانھا.(البحر الرائق :۲/۴۸۹)

وفي الدر:[وکرہ ذوق شيء ومضغہ بلاعذر] قید فیھما. قالہ العیني: ککون زوجھا أو سیدھا سيء الخلق فذاقت.(الدر المختار مع الشامي :۳/۳۹۵)

اب سوال یہ ہے کہ ہوٹلوں وغیرہ کے طباخ و باورچی کو کیا حالتِ روزہ میں چکھنے کی اجازت ہوسکتی ہے؟

راقم کا خیال یہ ہے کہ اجازت ہونی چاہیے؛ کیوں کہ فقہائے کرام نے بلا عذر کسی چیز کے روزے میں چکھنے کو مکروہ قرار دیا ہے اور یہاں عذر موجود ہے، جیسے عورت اور غلام کے مسئلے میں عذر موجود ہے۔

طباخ کا گذران ہی اس کے اس پیشے پر ہوتا ہے اور اس پیشے کے لیے یہ چیز لازم ہے کہ چکھ کر مزہ معلوم کرے، ورنہ اس کے پیشے پر اثر اور ملازمت میں خلل آسکتا ہے، یہ عذر ایک اعتبار سے غلام اور عورت کے عذر سے بھی شدید ہے؛ لہٰذا احقر کی رائے یہ ہے کہ طباخ کو حالتِ روزہ میں اپنے کام کے موقع پر چکھنے کی اجازت ہونی چاہیے۔(واللہ اعلم)

یہاں تک لکھنے کے بعد " **الفقه على المذاهب الأربعة** " دیکھا، تو اس میں حنفیہ کے مسلک کا ذکر کرتے ہوئے، طباخ کو بھی چکھنے کی اجازت بتائی ہے۔[1]

روزے میں ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل

روزے کی حالت میں گرمی کو دفع کرنے اور ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے غسل کرنا یا پانی میں تر کیا ہوا کپڑا لپیٹنا کیا حکم رکھتا ہے؟

اس سلسلے میں جمہور کی رائے یہ ہے کہ جائز ہے اور اس میں کوئی کراہت نہیں، علامہ شرنبلالی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ

---

(۱) **الفقه على المذاهب الأربعة :۱/ ۵۶۹**

نیز علامہ شرنبلالی رحمۃ اللہ نے بھی اجیر (مزدوری پر پکانے والے) کو اجازت دی ہے۔

فقال: وللمرأة ذوق الطعام إذا كان زوجها سيء الخلق......وكذا الأمة قلت وكذا الأجير. (مراقي الفلاح:۲۴۸)

روزہ دار کے لیے نو چیزیں مکروہ نہیں اور ان میں ٹھنڈک کے لیے غسل کرنے اور تر کپڑے سے اپنے کو لپیٹنے کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ یہی مفتیٰ بہ قول ہے۔(۱)

نیز عالمگیری میں ہے کہ یہی قول " ظاهر الرواية " ہے۔(۲)

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتحِ مکہ کے موقع پر درمیانِ سفر میں مقامِ عرج پر روزے کی حالت میں پیاس یا سخت گرمی کی وجہ سے، اپنے سر پر پانی ڈالا تھا، اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔(۳)

نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ وہ روزے کی حالت میں کپڑا تر کر کے لپیٹ لیا کرتے تھے۔(۴)

---

(۱) قال: وسبعة أشياء لاتكره للصائم ......والاغتسال والتلفف بثوب مبتل للتبرد على المفتىٰ به، (نور الإيضاح مع مراقي الفلاح:۲۴۸-۲۴۹)

وفي الدر: لاتكره حجامة وتلفف بثوب مبتل ومضمضة أو استنشاق أو اغتسال للتبرد عند الثاني وبه يفتىٰ (درمختار مع شامی:۳/۳۹۹)

(۲) وكره الاغتسال وصب الماء على الرأس والاستنقاع في الماء و التلفف بالثوب المبلول. وقال أبويوسف: لا يكره وهو الأظهر كذا في محيط السرخسي . (عالمگیری:۱/۲۲۰)

(۳) قال أبوبكر: قال الذي حدثني: لقد رأيت رسول الله صلى الله عليه وسلم بالعرج يصب على رأسه الماء وهو صائم من العطش أو من الحر.

(أبوداود بتحقيق عوامة:۳/۱۵۲، الرقم،۲۳۵۷، السنن الكبرىٰ للنسائي:۳/ ۲۸۸، الرقم:۳۰۱۷، السنن الكبرىٰ للبيهقي:۴/ ۴۳۸، الرقم،۸۲۶۱)

(۴) عن عبد الله بن أبي عثمان قال :رأيت ابن عمر رضي الله عنه وهو صائم ، يبل الثوب ثم يلقه عليه ، وكذا يفعله عثمان بن أبي العاص وعبدالرحمن بن الأسود و غيرهم. (المصنف لابن أبي شيبة: ۶/۱۸۶-۱۸۷)

مگر امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے روزے کی حالت میں اس سے منع فرمایا ہے؛ کیوں کہ اس سے بے صبری اور بے چینی کا مظاہرہ ہوتا ہے، جو اچھی بات نہیں۔(۱)

لہٰذا بلاضرورتِ شدیدہ کے ایسا نہ کرے؛ ہاں اگر شدید ضرورت محسوس ہو، تو جمہور کے قول کے مطابق اس میں کوئی حرج نہیں اور اسی پر فتویٰ بھی ہے، جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں۔

آرام دہ سواریوں کے ذریعے سفر میں روزہ

آج کے اس سائنسی دور میں انسانوں کی راحت و آرام کے لیے ہزار ہا چیزیں ایجاد ہوتی جا رہی ہیں اور اس میں اضافہ و ترقی بھی ہوتی جا رہی ہے، اس سلسلے میں سفر کی مشکلات و مصائب پر قابو پانے کے لیے اور سفر میں آرام و راحت کی تحصیل کی خاطر آرام دہ سواریاں ایجاد ہو گئیں، جن سے ایک طرف طویل سفر، قصیر مدت میں پورا ہو جاتا ہے، تو دوسری طرف ان میں راحت کے اسباب بھی ہوتے ہیں، ایسی سواریوں پر سفر کرتے ہوئے روزے کا کیا حکم ہے؟

اس کے جواب سے قبل ذہن میں رہے کہ احادیث میں سفر میں روزے کے بارے میں تین طرح کے احکام ملتے ہیں، بعض میں سفر میں روزے کو افضل بتایا گیا ہے اور بعض میں روزہ ترک کرنے کو افضل قرار دیا ہے اور بعض میں دونوں باتوں میں اختیار دیا گیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ

جس نے (سفر) میں روزہ نہ رکھا، تو اس کو رخصت ہے اور جس

(۱) قال : وكرهها أبوحنيفة لما فيها من إظهار الضجر في العبادة .
(الشامي:۳/۴۰۰،مراقي الفلاح:۲۴۹، خانية على هامش الهندية:۱/۲۰۵)

نے روزہ رکھا، تو روزہ رکھنا افضل ہے۔ (۱)

بخاری میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ

سفر میں روزہ رکھنا کوئی بھلائی کا کام نہیں۔ (۲)

اور ابوداؤد میں ہے کہ

حضرت حمزہ اسلمی نے اللہ کے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ میں ہمیشہ سفر میں رہتا ہوں؛ مگر میرے میں قوت وطاقت ہے، تو رمضان میں میں روزہ رکھوں یا نہ رکھوں ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جیسی مرضی ہو ویسا کر لینا''۔ (۳)

پہلی حدیث سے سفر میں ''روزے کا افضل ہونا''، دوسری سے ''ترکِ روزے کا افضل ہونا'' اور تیسری سے ''دونوں باتوں میں اختیار ہونا معلوم ہوا''۔ علما وفقہا

---

(۱) عن أنس رضي الله عنه ــ مرفوعاً ــ من أفطر فرخصة ، ومن صام فالصوم أفضل ، يعني في السفر. (إعلاء السنن :۹/۱۵۱-۱۵۲، کنز العمال :۸/۵۰۵، الرقم ۲۳۸۵۳)

(۲) عن جابربن عبد الله رضي الله عنه قال :كان رسول الله ﷺ في سفر فرأى زِحاماً ورجلاً قد ظلل عليه ، فقال : ما هذا ؟ قالوا: صائم ، فقال :ليس من البر الصوم في السفر.

(البخاري:۳۶۹، الرقم:۱۹۴۶، المسلم:۴۳۲، الرقم:۱۱۱۵، الترمذي:۲/۸۲، الرقم:۷۱۰، أبو داود: ۲۷۳، الرقم ۲۴۰۷، ابن ماجة:۳/۱۶۳، الرقم ۱۶۶۴)

(۳) عن حمزة الأسلمي قال قلت : يا رسول الله ، إني صاحب ظهر أعالجه أسافرعليه و أكريه و إنه ربما صادفني هذا الشهر يعني رمضان وأنا أجد القوة و أنا شاب وأجد بأن أصوم يارسول الله أهون علي من أن أُؤَخِّره فيكون ديناً أفأصوم يارسول الله أعظم أجري أو أفطر ؟، قال: أي ذٰلك شئت يا حمزة!.

(أبو داود:۲۷۳، الرقم:۲۴۰۳)

نے ان روایات میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ جس کو برداشت کی قوت ہو، اس کے لیے سفر میں روزہ افضل ہے اور جس کے لیے کلفت کا سبب ہو، اس کے لیے ترکِ روزہ افضل ہے، جہاں مشقت متحقق نہ ہو، وہاں اختیار ہے۔ (۱)

اس تفصیل سے مسئلۂ مبحوث عنہ کا جواب نکل آیا کہ ”کوئی اور عذر نہ ہو، تو آرام دہ سفر میں روزہ رکھنا افضل ہے“۔

رمضان میں دن میں ہوٹل چلانا

آج کل شہروں میں اور بڑے قصبات میں ہوٹلوں کا عام رواج ہو گیا ہے اور ان کے مالکوں اور ان میں کام کرنے والوں کا گزارہ بھی انہی ہوٹلوں سے وابستہ ہے اور ان میں مسلم وغیر مسلم سبھی آتے اور کھاتے پیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ رمضان المبارک میں دن کے وقت ہوٹل چلانا شرعاً کیا حکم رکھتا ہے؟

حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ نے فرمایا:

رمضان کے احترام کی خاطر دن کے وقت ہوٹل بند رکھنا ضروری ہے، کھانے پینے والے خواہ کسی بھی مذہب کے ہوں۔ (۲)

مگر راقم کا خیال یہ ہے کہ رمضان میں دن کے وقت ہوٹل بند رکھنا اچھا ہے، مگر اس کو ضروری قرار دینا دشوار ہے؛ اس لیے کہ شریعت میں بعض لوگوں کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے، جیسے مسافر، مریض، دودھ پیتے بچے کی ماں، جب کہ روزہ رکھنے سے نقصان کا اندیشہ ہو، ایسے ہی حاملہ عورت اور بہت ہی بوڑھا آدمی (جس کو فقہا ”شیخ

---

(۱) الترمذي:۲/۸۲،فتح الباري:۵/۳۳۳-۳۳۴،عمدة القاري:۱۱/۶۲

(۲) فتاویٰ رحیمیہ:۵/۱۹۷

فانی'' سے تعبیر کرتے ہیں) ان سب کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے۔(۱)

اگر یہ لوگ کھا پی سکتے ہیں، تو ان کے لیے کھانا فراہم کرنا بھی کوئی غلط کام نہ ہونا چاہیے؛ لہٰذا ہوٹل والا اس نیت سے ہوٹل چلائے کہ اس قسم کے لوگ، جن کو شریعت نے اجازت دی ہے کہ وہ رمضان میں روزہ نہ رکھیں، وہ کھائیں پئیں، تو اس میں کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی اور شہروں کا حال یہ ہے کہ وہاں دن رات ہزاروں مسافر آمد ورفت کرتے ہیں؛ نیز بہت سے بڑے بڑے ہسپتال شہروں میں ہوتے ہیں، جہاں مریضوں کے ساتھ تیماردار لوگ رہتے ہیں، ان میں بھی بہت سے دوسرے شہروں اور علاقوں سے آئے ہوئے ہوتے ہیں اور مسافر ہوتے ہیں ایسے لوگوں کی سہولت کے لیے جب شریعت نے روزہ نہ رکھنے کی اجازت دی ہے، تو ان لوگوں کو کھانے کی فراہمی غلط کیوں؟ اور یہ سب محض خیالات نہیں؛ بل کہ واقعات ہیں؛ لہٰذا میری رائے میں رمضان میں ہوٹل چلانا فی نفسہٖ کوئی غلط نہیں اور بند رکھنا واجب نہیں۔

البتہ ہوٹل والوں کو چاہیے کہ رمضان میں کھانے کی جگہ پر پردوں کا اہتمام وانتظام کریں اور ایک بورڈ پر یہ اعلان لکھ دیں کہ

> ''یہاں صرف ان کے لیے کھانے کا انتظام ہے، جن کو روزہ رکھنے سے کوئی شرعی عذر ہے؛ لہٰذا بے عذر کوئی صاحب زحمت نہ فرمائیں''۔

---

(۱) قال: لمن خاف زيادة المرض الفطروللمسافر؛ وقال: وللحامل والمرضع إن خافتا على الولد أو النفس؛ وقال: وللشيخ الفاني.

(البحر الرائق: ۲/۴۹۲-۵۰۱، الهداية: ۲/۲۶۷-۲۷۰، الدرالمختارمع الشامي: ۳/۴۰۳-۴۰۴)

اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص بلا عذر آتا اور کھاتا ہے، تو ہوٹل والے پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں اور پردوں کی بات اس لیے عرض کی گئی کہ فقہا نے صاحبِ عذر کو بھی چھپ کر کھانے کی ہدایت فرمائی ہے، اگر چہ ایک قول یہ ہے کہ علی الاعلان اور سب کے سامنے بھی کھا سکتا ہے؛ مگر احتیاط اسی میں ہے کہ چھپ کر کھائے؛ لہٰذا اس کے پیشِ نظر پردہ ڈال دینا اچھا ہے۔(١)

روزے میں ڈائلیسس (DIALYSIS) کا حکم

آج کا دَور بیماریوں کا دَور ہے، مختلف قسم کی بیماریاں اور نئی نئی بیماریاں پیدا ہوتی جارہی ہیں، ان میں ایک عام بیماری گردے کی بیماری ہے، جس کی وجہ سے گردہ اپنا کام کرنا چھوڑ دیتا ہے اور اس کے نتیجے میں خون کے اندر فاسد مادہ جمع ہو جاتا ہے، جو گردے کے صحیح ہونے کی صورت میں اس کے عمل سے بدن سے خارج ہو جایا کرتا ہے؛ لہٰذا خون کو اس فاسد مواد سے صاف کرنے کے لیے گردے کا کام مشینوں (مصنوعی گردے) سے لیا جاتا ہے، جس کو (DIALYSIS) کہا جاتا ہے اور اس کا طریقۂ کار یہ ہوتا ہے کہ ایک ٹیوب لگا کر رگوں سے خون کے اندر کے فاسد

---

(١) چناں چہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے سوال ہوا کہ

رمضان میں جو بیمار ہو یا حائضہ، اس کو روزہ داروں کے روبہ رو پان یا روٹی وغیرہ کھانا شرعاً درست ہے یا نہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ

في النهاية :قيل: تأكل الحائض سراً، وقيل : هي والمسافر والمريض جهراً .(جامع الرموز:١/١٦٣)

اس سے معلوم ہوا کہ اس میں اختلاف ہے،اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ پوشیدہ ہو کر کھاوے۔ **ذكرهٗ مولانا التهانوي رحمہ اللہ معزياً إلىٰ جامع الرموز ۔**

(امداد الفتاوی:٢/١٤٢)

عناصر ومواد کو خارج کیا جاتا اور دوسرے ٹیوب کے ذریعے صالح خون کو دوبارہ بدن میں داخل کیا جاتا ہے اور خون کی اس صفائی کے لیے ضروری دوائیاں استعمال کی جاتی ہیں، جو خون کو صاف کرتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ روزے کی حالت میں اگر ڈائلیسس کرایا جائے، تو اس کا کیا حکم ہے، اس سے روزہ فاسد ہوگا یا نہیں؟

اس کے جواب میں علما کے خیالات مختلف ہیں، عام طور پر علمائے عرب کا رجحان یہ ہے کہ اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اس کارروائی میں انسان کے جسم میں دوائیاں پہنچائی جاتی ہیں؛ لہٰذا اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔

سعودی عرب کے مشہور دارالافتا " اللجنة الدائمة " کے بڑے بڑے مفتی حضرات، علامہ شیخ عبد العزیز بن باز، علامہ عبد الرزاق العفیفی اور شیخ عبد اللہ بن غدیان نے اس سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ

> "مستشفی الملک فیصل" اور ریاض کے فوجی ہسپتال کے مدیر سے اس مسئلے کی نوعیت کو جاننے کے بعد "لجنة" کا یہ فتویٰ ہے کہ ڈائلیسس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے۔(۱)

اور علامہ شیخ محمد بن صالح العثیمین نے اس مسئلے میں تردد کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ

> کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ گردے صاف کرنے کا عمل حجامت (پچھنہ لگانے) کی طرح نہیں ہے، حجامت میں تو خون بدن سے نکالا جاتا ہے اور بدن میں لوٹایا نہیں جاتا اور حدیث کے مطابق حجامت

---

(۱) فتاویٰ اللجنة الدائمة: ۱۰/۱۹۰-۱۹۱

سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور ڈائلیسس میں خون کو نکال کر صاف کر کے بدن میں لوٹایا جاتا ہے؛ لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ کہیں اس کے ساتھ کوئی غذائی مادہ بھی جو کھانے پینے سے مستغنی کر دینے والا ہوتا ہے، وہ اس میں شامل ہو؟ پس اگر ایسا ہے، تو اس سے روزہ فاسد ہو جائے گا؛ لہٰذا جس شخص کو روزانہ اس میں مبتلا ہونے کی نوبت آتی ہے، وہ اس مریض کے حکم میں ہے، جس کو امیدِ صحت نہ ہو اور وہ ہر دن مسکین کو فدیے میں کھانا کھلائے اور اگر کسی دن یہ عمل ہوتا ہو اور کسی دن نہیں، تو اس کو ڈائلیسس کے دن کا روزہ چھوڑ دینا اور بعد میں قضا کر لینا چاہیے اور اگر ڈائلیسس میں کوئی غذائی مواد شامل نہیں ہوتا؛ بل کہ صرف خون کی صفائی ہوتی ہے، تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔(۱)

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی غذائی مادہ خون میں شامل کیا جاتا ہے، تو اس کی وجہ سے اس مریض کا روزہ فاسد ہو جائے گا؛ لیکن اگر غذائی مادے کے بہ جائے صرف کوئی دوائی مواد خون کی صفائی کے لیے شامل کیا جاتا ہے، تو روزہ فاسد نہ ہوگا۔

شیخ عبد اللہ بن باز رحمہ اللہ نے روزے کی حالت میں، مریضِ گردے کے خون کی تبدیلی کے سوال پر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ

" یلزمه القضاء بسبب ما یزود به من الدم النقي، فإن زود مع ذٰلک بمادة أخری فهي مفطر آخر ".(۲)

یہ سارے فتاویٰ اس بنیاد پر ہیں کہ خون کے ساتھ غذائی مواد یا کیمیاوی مواد

---

(۱) فتاوی الشیخ العثیمین : ۱۹/۱۱۳-۱۱۴

(۲) فتاویٰ بن باز :۱۵/ ۲۷۵

اندر داخل کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے اور عام طور پر علمائے عرب کے نزدیک بدن میں غذائی مواد کسی بھی طرح داخل ہو جانے سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ ڈائلیسس میں اگر چہ خون کے ساتھ غذائی یا کیمیاوی مواد بدن میں داخل کیا جاتا ہے؛ مگر یہ رگوں کے ذریعے داخل کیا جاتا ہے، نہ کہ منفذِ اصلی سے اور یہ بات انجکشن کے مسئلے کے تحت واضح کر دی گئی ہے کہ بدن کے اندر کسی چیز کا پہنچنا یا پہنچانا دو شرطوں کے ساتھ مفسد ہوتا ہے:

ایک تو یہ کہ یہ چیز جوفِ بدن میں پہنچے اور دوسرے یہ کہ منفذِ اصلی کے راستے سے پہونچے، اگر کوئی چیز بدن میں اندر داخل ہوئی؛ مگر جوف میں نہیں گئی یا جوف میں تو گئی، مگر منفذِ اصلی سے نہیں گئی، تو اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ لہٰذا ڈائلیسس میں غذائی و کیمیاوی مواد خون میں شامل کر کے اندر پہنچایا جاتا ہے؛ مگر یہ منفذِ اصلی سے نہیں؛ بل کہ رگوں سے پہنچایا جاتا ہے؛ لہٰذا اس سے روزہ فاسد نہیں ہونا چاہیے؛ تاہم احتیاط یہی ہے کہ روزے کی حالت میں اس سے احتیاط کی جائے، یا کم از کم رات کے وقت کرایا جائے۔

روزے میں ''انیما'' (ENEMA) کا حکم

پیٹ کی صفائی کے لیے، ڈاکٹر لوگ ''انیما'' (ENEMA) دیتے ہیں، جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ پیچھے کے راستے سے دوا پہنچاتے ہیں، اس کو عربی میں ''الاحتقان'' کہا جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ بات واضح ہے کہ اس سے روزہ فاسد ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس سے مقعد کے ذریعہ دوا اندر پہنچتی ہے اور یہ مفسدِ صوم ہے، حضراتِ فقہا نے احتقان کا مسئلہ صراحت کے ساتھ لکھا ہے اور اس کو مفسد قرار دیا ہے۔

" وإذا احتقن ، أفطر " .[۱]

اور "بدائع الصنائع" میں ہے کہ

" وما وصل إلى الجوف أو إلى الدماغ عن المخارق الأصلية كالأنف والأذن والدبر، بأن استعط أو احتقن أو أقطر في أذنه، فوصل إلى الجوف أو إلى الدماغ فسد صومهٗ " .[۲]

دائم المرض کا حکم

بعض امراض ایسے ہوتے ہیں کہ عموماً ان سے شفا نہیں ہوتی اور ایسے مریض "دائم المرض" ہوتے ہیں، جیسے ذیابیطس، بلڈ پریشر، گردے کی بیماری؛ وغیرہ، اگر کوئی مریض اس قسم کے مرض کا شکار ہو، تو ایسے مریض پر روزہ رکھنا ضروری ہے یا اس کے لیے کوئی چھوٹ ہے اور اگر ہے، تو اس کو کیا کرنا چاہیے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دائم المرض آدمی، اگر ایسی بیماری میں مبتلا ہے کہ اس پر روزے کا کوئی اثر نہیں پڑتا، تو اس کو روزہ رکھنا چاہیے اور اگر روزہ رکھنے سے نقصان کا اندیشہ ہو اور مسلمان دین دار ڈاکٹر اس کی تصدیق کرے، تو اس کو روزہ ترک کر کے اس کے بدل فدیہ دینے کی گنجائش ہے؛ یہ حکم فقہا کے بیان کردہ "شیخِ فانی" کے حکم سے مستنبط کیا جا سکتا ہے، شیخِ فانی کے سلسلے میں فقہا نے لکھا ہے کہ اس کو روزے کے بدلے میں فدیہ دے دینا چاہیے اور شیخِ فانی کی تعریف میں کہا ہے کہ

" الذي فنيت قوتهٗ أو أشرف على الفناء " .

---

(۱) البحر الرائق:۲/۲۹۹،الدر المختار:۲/۴۰۲

(۲) بدائع الصنائع: ۲/۲۲۲

اور بعضوں نے کہا کہ

" الذي كل يوم في نقص إلى أن يموت ". (۱)

اور شیخِ فانی کو روزہ نہ رکھنے اور فدیہ دے دینے کی اجازت کا مدار فقہا نے روزہ رکھنے سے اس کا مایوس ہو جانا لکھا ہے، "المحیط البرهاني" میں ہے کہ

و أما الشيخ الفاني يفطر و يفدي ؛ لأنه وقع اليأس له عن الصوم ؛ لأن الشيخ الفاني أن يكون عاجزاً عن الأداء في الحال ، و يزداد عجزه كل يوم إلىٰ أن يموت". (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ اصل علتِ جوازِ فدیے کی " یأس و مایوسی " ہے۔

اور اسی لیے - بہ قول صاحب المحيط البرهاني - فقہا نے بیمار اور شیخِ فانی میں فرق کیا ہے کہ شیخِ فانی میں یأس ہوتی ہے، جب کہ بیمار میں یأس نہیں ہوتی اور وجوبِ فدیے کی شرط تحققِ یأس ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شیخِ فانی کے لیے جوازِ افطار و وجوبِ فدیہ کی علت روزہ رکھنے سے مایوس ہو جانا ہے؛ لہٰذا اگر یہ علت مریض میں پائی جائے، مثلاً مریض ایسا ہو کہ اس کی صحت یابی کی امید نہ ہو اور روز بہ روز کمزور ہوتا جاتا ہو، یا اس کی انتہا موت ہو، تو اس کا حکم بھی یہی ہونا چاہیے کہ وہ فدیہ دے دے۔

صاحب " المحيط البرهاني" نے اوپر کی تفصیل لکھنے کے بعد، اسی بات کو مشائخ کی جانب منسوب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

" قال مشائخنا : إذا كان مريضاً يعلم أن آخرهٗ

---

(۱) الشامي: البحر الرائق:۲/ ۳۰۸

(۲) المحيط البرهاني:۲/ ۶۵۵

الموت ، و ابتدأ ذلک حتی أمکنه الإیصاء ، یجعل في هذه الحالة بمنزلة الشیخ الفاني، و هذا شيء یجب أن یحفظ جداً "۔[۱]

عرب کے مشہور فقیہ "شیخ العثیمین" نے بھی یہی فتوی دیا ہے، وہ اس مسئلے پر بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ

وخلاصة ذلک أن المرض قسمان: مرض طارئ یرجیٰ زواله، فهذا ینتظر حتی یعافیه اللّٰه ، ویقضي، و مرض ملازم ، فهذا یطعم کل یوم مسکینا "۔[۲]

اسی طرح شیخ بن باز نے ایک سائل کے جواب میں، جو آدھے جسم پر فالج گر جانے کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا تھا، اس کے جواب میں لکھا ہے کہ

" إذا قرر الأطباء المختصون أن مرضک هذا من الأمراض التي لا یرجیٰ برؤها، فالواجب علیک إطعام مسکین عن کل یوم من أیام رمضان ولا صوم علیک، أما إذا قرروا أنهٔ یرجیٰ برؤه فلا یجب علیک إطعام وإنما یجب علیک قضاء الصیام إذا شفاک اللّٰه من المرض"۔[۳]

الغرض! جو بیمار دائمی بیماری میں مبتلا ہو اور صحت یابی کی کوئی امید نہ ہو، تو اس کو بھی شیخِ فانی کی طرح جائز ہے کہ روزہ چھوڑ دے اور اس کے بدلے میں فدیہ ادا کردے۔

---

(۱) المحیط البرهاني:۲/۶۵۵

(۲) فتاویٰ الشیخ العثیمین :۱۹/۱۱۰

(۳) فتاویٰ شیخ بن باز :۱۵/۲۲۱

سرخی (Lipstick) کا حکم

عورتیں اگر روزے کی حالت میں اپنے لبوں پر سرخی یعنی لپ سٹک لگائیں، تو اس کا روزے پر کیا اثر ہوگا، روزہ فاسد یا مکروہ ہوگا یا نہیں؟

جواب یہ ہے کہ لبوں پر سرخی لگانے سے روزہ فاسد تو نہیں ہوتا؛ بہ شرطے کہ اس کا کوئی جز حلق میں نہ جائے، اگر حلق میں جائے گا، تو روزہ فاسد ہو جائے گا اور اگر حلق میں نہ جائے؛ لیکن اگر اس کا اثر منہ کے اندر جانے کا خوف ہو، تو مکروہ ہوگا؛ حضرت مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ

''یہ سرخی لگانا جائز ہے؛ لیکن منہ کے اندر جانے کا احتمال ہو، تو مکروہ ہے''۔(۱)

بواسیری مسوں پر دوا لگانے اور کانچ تر کر کے چڑھانے کا حکم

بواسیر کی بیماری میں مسوں پر دوا لگانے کا اثر روزے پر کیا ہوتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بواسیری مسے دو نوعیت کے ہوتے ہیں: ایک باہر کے مسے، ان پر دوا لگانے سے روزے پر کوئی اثر نہ ہوگا اور دوسرے اندرونی مسے، ان پر دوا لگانے سے جوف تک پہنچ جائے، تو ان پر دوا لگانے سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔

علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ نے ''فتح القدیر'' میں اور علامہ زیلعی رحمۃ اللہ نے ''تبیین الحقائق''میں لکھا ہے:

'' لوخرج سُرمُه فغسله ، ثبت ذلک الوصول بلااستبعاد ، فإن قام قبل أن ینشفه فسد صومه بخلاف

---

(۱) احسن الفتاوی:۴/۴۳۴

ماإذا نشفه ؛ لأن الماء اتصل بظاهر ثم زال قبل أن يصل إلىٰ الباطن بعود المقعدة" .(۱)

علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ نے "مراقي الفلاح" میں لکھا ہے کہ

ولو خرج سرمه فغسله إن نشفه قبل أن يقوم و يرجع لمحله لا يفسد صومه لزوال الماء الذي اتصل به " (۲)

بواسیر والے کو کانچ تر کر کے چڑھانے کا حکم بھی وہی ہے، جو بواسیری مسوں کا اوپر عرض کیا گیا کہ اس سے بھی روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ جب کہ بغیر خشک کیے چڑھا لے اور اگر خشک کرنے کے بعد چڑھائے،تو روزہ فاسد نہ ہوگا۔

سحری سعودی میں-افطار ہندوستان میں

آج کل کی سہولیات نے سفر کو اس قدر آسان کر دیا کہ لمبے لمبے اسفار بہت جلدی سے قطع ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک شخص صبح ایک ملک میں کرتا ہے،تو شام دوسرے ملک میں کرتا ہے اور ان ملکوں کے مابین کی مسافت ہزاروں میل کی ہوتی ہے؛ لہٰذا بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص سعودی عرب میں یا کسی اور ملک میں سحری کرتا ہے اور دوسرے ملک میں جا کر افطار کا وقت ہوتا ہے،تو اس شخص کو افطار کس ملک کے حساب سے کرنا چاہیے؟

اس کا جواب سب معاصر فقہا کے نزدیک یہ ہے کہ افطار کے وقت وہ جس ملک میں ہے، اس کا لحاظ کرتے ہوئے افطار کرے گا؛ لہٰذا سعودی میں سحری کر کے ہندوستان آیا،تو افطار ہندوستان کے وقت کے مطابق کرے گا؛ اگر چہ کہ اس کا روزہ

---

(۱) فتح القدير:۲/۳۴۲،تبيين الحقائق :۲/۱۸۳،احسن الفتاویٰ:۴/۴۴۰

(۲) مراقي الفلاح :۲۵۲

اس صورت میں بہت چھوٹا ہوگا؛ کیوں کہ سعودی عرب کا وقت ہندوستان کے لحاظ سے ڈھائی گھنٹے بعد ہوتا ہے؛ لہٰذا وہ وہاں کے حساب سے جب سحری کرے گا، تو ہندوستان کے لحاظ سے ڈھائی گھنٹے بعد کرے گا اور وہاں سے جب ہندوستان پہنچے گا، تو افطار سعودی عرب کے لحاظ سے ڈھائی گھنٹے پہلے ہوگا؛ مگر اس کے باوجود، اس کو ہندوستان ہی کے لحاظ سے افطار کرنا چاہیے اور اس کے برعکس اگر کوئی ہندوستان میں سحری کرے اور سفر کر کے سعودیہ کو چلا جائے، تو روزہ بڑا ہو جائے گا؛ مگر اس کو بھی اسی اصول کے تحت وہاں کے لحاظ سے افطار کرنا ہوگا۔

شیخ عبداللہ بن باز رَحِمَہُ اللہُ نے یہی فتویٰ دیا ہے، ان سے کسی نے یہ سوال کیا کہ میں نے اپنے ملک میں سحری کی اور اسی دن سعودی میں ریاض کو پہنچ گیا اور اہلِ ریاض کے ساتھ افطار کیا، جب کہ میرے ملک اور ریاض کے وقت میں ایک گھنٹے کا فرق ہے، تو کیا مجھ پر اس کی قضا ہے؟

تو شیخ نے جواب لکھا کہ اس میں کوئی حرج نہیں؛ اس لیے کہ آدمی جہاں ہوتا ہے، سحری و افطار میں اسی کا حکم لگتا ہے اور دو ملکوں کے مابین دن کے چھوٹا یا بڑا ہونے کا فرق ہوتا ہے اور طلوع وغروب کے پہلے و بعد ہونے کا فرق ہوتا ہے، اس سے کوئی نقصان نہیں۔ (۱)

آنکھ، کان، ناک کے قطرات (Drops) کا حکم

آنکھ، کان، ناک کے قطرات (Drops) کا استعمال روزے کی حالت میں کیا حکم رکھتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا حکم الگ ہے، آنکھ میں ڈالے

(۱) فتاویٰ الشیخ بن باز: ۱۵/۳۲۱-۳۲۲

جانے والے قطرات کا روزے میں استعمال جائز ہے اور اس کا روزے پر کچھ اثر نہیں پڑتا؛ کیوں کہ جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے، روزے کو فاسد کرنے والی چیز وہ ہے، جو جوف میں بہ راہِ منفذِ اصلی پہنچے اور آنکھ اور جوف میں کوئی منفذِ اصلی نہیں ہے؛ لہٰذا آنکھ میں دوا اور ڈراپس کا استعمال جائز ہے۔

اور کان کے قطرات کا حکم یہ ہے کہ اس سے فقہا کے قول کے مطابق روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ کان اور جوف کے درمیان منفذ ہے اور اس سے یہ قطرات اندر پہنچتے ہیں اور یہ مفیدِ بدن بھی ہیں؛ لہٰذا معنے کے لحاظ سے افطار پایا گیا۔

ناک کے قطرات کا حکم بھی یہی ہے کہ اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ ناک ایک منفذ ہے؛ جس سے جوفِ معدے میں یہ قطرات پہنچتے ہیں اور یہ بات حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے؛ چناں چہ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"بالغ في الاستنشاق إلا أن تكون صائما ."[1]

اس حدیث میں آپ نے ناک میں پانی ڈالنے میں مبالغہ کا حکم دیا اور روزے کی حالت کو اس سے مستثنیٰ کیا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ روزہ میں اگر ناک میں پانی چلا جائے تو روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ اسی لیے آپ نے روزہ میں مبالغہ کو منع کیا ہے؛ لہٰذا ناک میں قطرات ڈالنے سے روزہ فاسد ہو جائے گا۔

روزے میں ہونٹوں یا چہرے وغیرہ پر کریم (cream) کا استعمال

کریم (Cream) مختلف قسم کے استعمال کیے جاتے ہیں، بعض ضرورت

(۱) أبو داود:۲۳۶۶، الترمذي:۷۸۸

کے لیے جیسے ہونٹوں اور پیروں کے سردی وغیرہ سے پھٹ جانے پر لگاتے ہیں اور بعض محض آرائش کے لیے، جیسے عموماً عورتیں ہونٹوں پراور چہرے پر استعمال کرتی ہیں، روزے کی حالت میں ان کا استعمال جائز ہے یا نہیں؟ اور روزے پر ان کا کیا اثر ہوگا؟

جواب یہ ہے کہ ان کا استعمال روزے میں جائز ہے اور اس سے روزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ البتہ جو کریم ہونٹوں پر لگائی جاتی ہے، وہ اگر منہ کے اندر جانے کا خوف ہو، تو اس میں کراہت ہے۔

مستقل طور پر ڈرائیونگ (Driving) سے روزہ چھوڑنے کا حکم

کار یا بس یا ٹرین وغیرہ کے ڈرائیور، جو تقریباً ہمیشہ ہی سفر میں رہتے ہیں اور ایک بستی سے دوسری بستی کی جانب چلتے رہتے ہیں، ان کے روزے کے بارے میں سوال یہ ہے کہ مسافر ہونے کی وجہ سے کیا ان کو بھی عام مسافرین کا حکم ہے اور کیا یہ لوگ سفر کی وجہ سے روزہ چھوڑ سکتے ہیں؟ اور اگر چھوڑ سکتے ہیں، تو پھر یہ لوگ اس کی قضا کب کریں، جب کہ یہ ہمیشہ ہی سفر میں رہتے ہیں؟

اس مسئلے میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ان کا سفر اڑتالیس ۴۸ میل یعنی ستہتر ۷۷ کلو میٹر یا اس سے زیادہ کا ہو، تو یہ لوگ مسافر ہیں اور مسافر ہونے کی وجہ سے ان کو وہ سہولت بھی ملے گی، جو سفر شرعی کی وجہ سے مسافرین کو ملتی ہے، مثلاً نماز میں قصر، روزے میں تاخیر اور بعد میں اس کی قضا، وغیرہ؛ لہٰذا ڈرائیور لوگ جو ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں، ان کو اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے؛ یہ لوگ رمضان میں اگر سفر میں ہوں، تو روزہ ترک کر سکتے ہیں اور ان کو بعد میں ان کی روزوں کی قضا کرنی ہوگی، اب رہا یہ سوال کہ لوگ قضا کب کریں؟ تو جواب یہ ہے کہ رمضان کے ایک ماہ کے روزہ پورے سال میں کچھ کچھ کر کے رکھے جا سکتے ہیں اور اپنی چھٹیوں

میں ان کو پورا کرلیں اور اگر یہ مشکل ہو، تو پھر بہتر یہ ہے کہ روزہ نہ چھوڑیں اور رمضان میں ہاتھ کے ہاتھ رکھ لیں، اس میں سہولت رہتی ہے۔

اور اگر یہ ڈرائیور لوگ مذکورہ سفر سے کم کا سفر کریں، یا اپنے شہر اور دیہات میں بس چلاتے ہوں، تو ان کو روزہ چھوڑنے کی کوئی گنجائش نہیں؛ کیوں کہ یہ سفرِ شرعی نہیں ہے، جس میں سہولتیں ملتی ہیں، علامہ شیخ صالح العثیمین نے لکھا ہے کہ

> ڈرائیور بھی سفرِ شرعی کی صورت میں مسافر ہی ہیں؛ لہٰذا وہ روزہ ترک کرسکتے ہیں، اگر چہ کہ وہ دائمی طور پر سفر میں رہتے ہوں اور ایسے لوگ جب گھر پر رہیں، تو روزہ رکھ لیں اور سردیوں کے موسم میں روزہ رکھ لیں کہ یہ آسان ہوتے ہیں۔ (۱)

ہوائی جہاز میں سحری وافطار

روزہ دار اگر ہوائی جہاز میں سفر کررہا ہو، تو اس کو بعض مسائل پیش آتے ہیں:

(۱) ایک یہ کہ اس دوران سحری و افطار کا وقت کس حساب سے مانا جائے؛ کیوں کہ ہوائی جہاز تیز رفتاری کی وجہ سے بہت جلد مسافت قطع کرتا رہتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ شریعت میں سحری کا انتہائی وقت صبح صادق ہے اور افطار کا وقت غروبِ آفتاب ہے اور ہوائی جہاز کے مسافر کو اس کے معلوم کرنے میں کوئی مشقت نہیں؛ کیوں کہ وہ ہوائی جہاز سے اس کا مشاہدہ اچھی طرح سے کرسکتا ہے کہ صبح صادق ہوگئی یا نہیں اور آفتاب غروب ہوگیا یا نہیں؛ لہٰذا یہاں مشاہدے سے کام لیتے ہوئے، وہ سحری وافطار کرے۔

اور اگر بادل چھایا ہوا ہو، جس کی وجہ سے سورج کا غروب ہونا اور صبح صادق کا

---

(۱) خلاصہ از: فتاویٰ الشیخ العثیمین: ۱۹/۱۴۱-۱۴۲

ہوجانا معلوم نہ ہو سکے، تو اس وقت ظنِ غالب سے کام لے اور جو بات غالب گمان سے معلوم ہو، اس پر عمل کر لینا کافی ہے۔(۱)

(۲) دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہوائی جہاز میں یہ معلوم کر کے کہ جہاز اس وقت کہاں ہے، اس مقام کی جنتری سے کام لیتے ہوئے سحری وافطار کرے، تو کیا یہ صحیح ہوگا؟

اس میں احقر کا خیال یہ ہے کہ یہ بات صحیح نہیں؛ کیوں کہ یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ زمین اور فضا میں طلوع وغروب آفتاب اور اسی طرح طلوعِ سحر کا وقت الگ ہوتا ہے، بسا اوقات زمین پر غروبِ آفتاب ہو چکا ہوتا ہے؛ مگر ہوائی جہاز میں بیٹھا ہوا مسافر سورج کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے؛ اس لیے مقام معلوم کر کے وہاں کی جنتری پر عمل صحیح نہیں۔

(۳) اگر ہوائی جہاز سے اڑان سے پہلے سطحِ زمین پر دیکھا کہ سورج غروب ہو گیا؛ اس لیے روزہ دار نے افطار کر لیا، پھر جب اڑان ہوئی، تو دیکھا کہ سورج غروب نہیں ہوا ہے، تو کیا اب وہ روزے کی قضا کرے؟

علما نے لکھا ہے کہ روزے کی قضا کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ وہ جب سطحِ زمین پر تھا، تو وہاں غروب ہو گیا اور اس کا روزہ مکمل ہو گیا۔(۲)

(۴) اور اگر ہوائی جہاز میں کسی قریبی شہر کے وقت کا اعلان کیا گیا کہ وہاں افطار کا وقت ہو چکا؛ جب کہ ہوائی جہاز والوں کو سورج ابھی تک نظر آ رہا ہے اور غروب نہیں ہوا ہے، تو ان کو اس اعلان پر افطار کرنا جائز نہیں؛ کیوں کہ ان کا وقتِ افطار ابھی نہیں ہوا۔(۳)

---

(۱) فتاوی الشیخ العثیمین:۱۹/۳۳۲

(۲) فتاویٰ اللجنۃ الدائمۃ:۱۰/۱۳۶، فتاویٰ الشیخ العثیمین:۱۹/۳۳۲-۳۳۳

(۳) دیکھو: فتاوی اللجنۃ:۱۰/۲۹۵-۲۹۸

(۵) اگر ہوائی جہاز پر وہاں کے قریبی شہر میں افطار وسحری کا وقت ٹیلی ویژن یا گھڑی سے پتہ لگا کر اس پر عمل کرنا کیسا ہے؟

جواب یہ ہے کہ یہ صحیح نہیں؛ کیوں کہ جیسا اوپر عرض کیا، ہوائی جہاز کے وقت میں اور نیچے زمین کے وقت میں فرق ہوتا ہے؛ اسی لیے "اللجنة الدائمة" کے علمانے لکھا ہے کہ اگر ہوائی جہاز میں روزہ دار گھڑی یا ٹیلی ویژن سے قریبی علاقے کے افطار کا وقت معلوم کر کے افطار کر لے؛ جب کہ اس کو سورج نظر آرہا ہو، تو یہ جائز نہیں؛ کیوں کہ اس کے حق میں ابھی افطار کا وقت نہیں ہوا۔ (۱)

ہوائی جہاز میں سوار اور بلند عمارات پر رہنے والوں کے لیے افطار کا وقت

جدید ٹکنالوجی نے ہر چیز میں جدت اور ترقی کا سامان پیدا کر دیا؛ جس کی وجہ سے آج بڑے شہروں میں بڑی بڑی فلک بوس بلند عمارات پائی جاتی ہیں، جو بعض جگہ سو وں سے بھی زیادہ منزلوں پر مشتمل ہیں، ان میں رہنے والوں کو کبھی افطار کے وقت میں نیچے رہنے والوں کے لحاظ سے فرق محسوس ہوتا ہے؛ مثلاً نیچے غروبِ آفتاب ہو چکا ہے اور اذانِ مغرب ہو رہی ہے؛ لیکن ان بلند عمارات میں رہنے والے اپنی آنکھوں سے سورج کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو ان لوگوں کو کس کا اعتبار کرنا چاہیے؟

جواب یہ ہے کہ ہوائی جہاز میں سوار اور بلند عمارات میں رہنے والوں کو اپنے مشاہدے کے مطابق افطار کرنا چاہیے؛ کیوں کہ ہر شخص کے لیے حکم یہ ہے کہ افطار اس وقت کرے، جب سورج اس کے حق میں غروب ہو جائے؛ لہٰذا جب سورج کو

---

(۱) فتاویٰ اللجنة الدائمة: ۱۰/۱۳۶-۱۳۷

غروب ہوتے دیکھے،تو افطار کرے اور اگر سورج کو موجود پائے،تو غروب کا انتظار کرے، نیچے والوں کے لحاظ سے اس کو افطار کی اجازت نہیں ہے۔

امتحانات کی وجہ سے روزے کا ترک

بعض حضرات نے سوال کیا کہ اسکول و کالج یا یونیورسٹی کے امتحانات کے موقعے پر طلبہ کو بڑی محنت کرنی پڑتی ہے اور رات دن ایک کر کے اپنے اسباق کو دہرانے کی ضرورت ہوتی ہے اور اگر ایسی محنت نہ کی جائے،تو ناکام ہونے کا خطرہ ہے اور اس سے ایک طالب علم کی ساری محنت اور روپیہ پیسہ سب ضائع ہو جاتا ہے اور بعض طالبِ علم غریب ہوتے ہیں،تو ان کے لیے یہ ناکامی زندگی کا بڑا مسئلہ ہے۔اس صورتِ حال کے پیشِ نظر امتحانات اگر رمضان میں آجائیں،تو چوں کہ روزے سے رہتے ہوئے محنت مشکل ہے؛ لہٰذا کیا روزے کو اس کی وجہ سے چھوڑا جاسکتا ہے؟

جواب یہ ہے کہ امتحانات کی وجہ سے روزے جیسے اہم فرض کو چھوڑنا جائز نہیں، اس سے گناہ لازم آتا ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ان لوگوں کی نظر میں روزے کا دنیا کے مقابلے میں ہلکا ہونا لازم آتا ہے؛ لہٰذا ایسے طلبہ کو راتوں میں محنت کرنا چاہیے؛ تاکہ کامیاب ہوں اور روزہ ترک نہیں کرنا چاہیے؛ اگر کسی نے ایسا کیا،تو گناہ ہوگا اور اس پر روزے کی قضا لازم ہوگی۔

شیخ العثیمین نے ایک لڑکی کے سوال پر کہ اس نے امتحانات کی وجہ سے چند روزے ترک کر دیے تھے،اب کیا کرنا چاہیے؟ لکھا ہے کہ

امتحان کی وجہ سے روزہ چھوڑنا غلطی ہے اور جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ رات میں مطالعہ کرسکتی تھی اور یہاں کوئی ایسی ضرورت

نہیں ہے کہ روزہ ترک کردے؛ لہٰذا اس پر لازم ہے کہ اللہ سے توبہ کرے اور اس پر ان روزوں کی قضا بھی لازم ہے۔ (۱)

اور"اللجنة الدائمة"کے مفتیان نے اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ

" الامتحان المدرسي ونحوهٗ لا يعتبر عذراً مبيحاً للإفطار في نهار رمضان "(۲)

اور شیخ بن باز نے لکھا ہے کہ:

" لا يجوز للمكلف الإفطارَ في رمضان من أجل الاختبار ؛ لأن ذٰلک ليس من الأعذار الشرعية ؛ بل يجب عليه الصوم ، وجعل المذاكرة في الليل إذا شق عليه فعلها في النهار "(۳)

ہاں! اسکول وکالج کے ذمہ دار اگر مسلمان ہیں، تو ان کو چاہیے کہ اس سلسلے میں وہ رمضان کا لحاظ وخیال رکھتے ہوئے، امتحانات رمضان میں تجویز نہ کریں؛ بل کہ رمضان سے پہلے یا بعد میں تجویز کریں۔

محنت طلب کام کی وجہ سے ترکِ روزہ

ایک اہم سوال یہ سامنے آیا کہ بعض کارخانوں میں ملازمین کو محنت طلب کاموں پر رکھا جاتا ہے، جیسے لوہے وغیرہ کی فیکٹریوں میں ملازم کو کئی کئی گھنٹے تک

---

(۱) فتاوی الشیخ العثیمین:۱۹/ ۸۵

(۲) فتاوی اللجنة:۱۰/ ۲۴۱

(۳) فتاویٰ الشیخ بن باز :۱۵/ ۲۴۸

سخت ترین محنت کا کام کرنا پڑتا ہے اور اس حال میں روزہ رکھنا ان کے بس کا نہیں ہوتا، اب یہ ملازم لوگ روزہ رکھیں، تو کام نہیں کر سکتے اور اگر کام کریں، تو روزہ نہیں رکھ پاتے؛ اسی طرح بعض غریب لوگ کچھ محنت کی کمائی کر کے اپنا گزران کرتے ہیں اور ان کے کام بھی ایسے ہوتے ہیں کہ روزے کے ساتھ کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، تو سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو رمضان میں روزہ ترک کرنا جائز ہے یا نہیں؟

حضراتِ علما نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ان لوگوں کو روزہ ترک کرنا جائز نہیں ہے؛ کیوں کہ محنت طلب کام ان عذروں میں سے نہیں ہے، جن کی وجہ سے روزہ چھوڑنے کی گنجائش ملتی ہے؛ لہٰذا ان پر روزہ فرض ہے اور اس کا ترک حرام ہے اور اس سے وہ لوگ گناہ گار رہوں گے، شیخ عثیمین اور شیخ عبداللہ بن باز وغیرہ سب نے یہی لکھا ہے۔(۱)

ہاں! یہ لوگ روزہ رکھنے کے بعد کام کرتے تھک جائیں اور اس کی وجہ سے روزے کو باقی رکھنے میں سخت مشکل پیش آئے، جس کو وہ برداشت نہ کر سکے، تو وہ اس عذر کی وجہ سے روزہ توڑ سکتے ہیں اور بعد میں اس کی قضا کرنا پڑے گا۔

شیخ بن باز لکھتے ہیں کہ

" و أصحاب الأعمال الشاقة داخلون في عموم المكلفين ، وليسوا في معنى المرضىٰ والمسافرين، فيجب عليهم تبييت نية صوم رمضان، وأن يصبحوا صائمين ، و من اضطر منهم للفطر أثناء النهار، فيجوز لهٗ أن يفطر بما يدفع اضطرارهٗ، ثم يمسك بقية يومهٖ ، و يقضيه في الوقت المناسب، و من لم يحصل له

(۱) دیکھو: فتاوی الشیخ العثیمین:۱۹/۸۹،فتاویٰ الشیخ عبد اللّٰہ بن باز :۱۵/۲۴۵-۲۴۶

ضرورةً ، وجب عليه الاستمرار في الصيام "(۱)

معدے یا قلب وغیرہ میں تشخیص یا علاج کے لیے ٹیوب داخل کرنا

آج کل تشخیصِ امراض کے لیے یا علاج کے لیے معدے یا قبل یا دوسرے اعضا میں اندر ٹیوب داخل کیا جاتا ہے اور اس سے اندرون حالات کا اسکیننگ بھی لیا جاتا ہے اور علاج بھی کیا جاتا ہے، اس سے روزہ فاسد نہیں ہوتا؛ اِلا یہ کہ اس ٹیوب میں کوئی دوا بھی استعمال کی جاتی ہو، جو اندر جوف میں پہنچتی ہو؛ پس اگر کوئی دوا اس پر نہیں ہوتی، تو محض اس ٹیوب کے داخل کرنے سے روزہ فاسد نہیں ہوتا۔ وھو ظاھر !

ہاں! اگر یہ آلہ کسی ضرورت سے اندر ہی چھوڑ دیا جاتا ہو، تو "احناف" کے نزدیک اس سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے؛ اس مسئلے کی نظیر فقہا کا بیان کردہ یہ جزئیہ ہو سکتا ہے:

علامہ کاسانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

" وكذا روي عن محمد في الصائم : إذا أدخل خشبة في المقعد أنه لايفسد صومه إلا إذا غاب طرفا الخشبة ، وهٰذا يدل علىٰ أن استقرار الداخل في الجوف شرط فساد الصوم ." (۲)

اور "عالمگیری" میں ہے:

" ولو أدخل إصبعهٗ في إستهٖ أو المرأة في فرجها لا يفسد وهو المختار ، إلا إذا كانت مبتلة بالماء أو الدهن

(۱) فتاویٰ الشیخ ابن باز :۱۵/ ۲۴۵-۲۴۶

(۲) بدائع الصنائع: ۲/ ۲۲۷

فحينئذ يفسد لوصول الماء أو الدهن ."(۲)

لہٰذا ان آلات سے دوصورتوں میں روزہ فاسد ہوجائے گا: ایک اس وقت جب کہ ان پر کوئی دوا موجود ہو، دوسرے اس وقت جب کہ ان آلات کو بدن میں چھوڑ دیا جائے۔
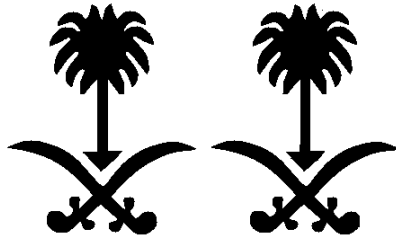
(۱) عالمگیری :۱/۲۰۴

اعتکاف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اعتکاف

اعتکاف کے متعلق یہاں جن مسائل کو پیش کیا گیا ہے، ان کا تعلق صرف رمضان کے آخری عشرے کے اعتکاف سے ہے، جس کو اعتکافِ مسنون کہتے ہیں، اعتکافِ واجب ونفل کے مسائل پر یہاں بحث مقصود نہیں۔

مسجد کی پہلی ودوسری منزل پر اعتکاف

آج کل بہت سے شہروں میں مسجدیں دودو، تین تین منزلہ بھی بننے لگی ہیں اور ممکن ہے کہ آگے چل کر ان منزلوں میں اور اضافہ وترقی ہو، اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہلی منزل یا دوسری منزل پر اعتکاف کرنا صحیح ہوگا یا نہیں؛ جب کہ پہلی دوسری منزلوں میں پنج وقتہ نماز نہیں ہوتی؛ بل کہ وہاں صرف جمعہ یا رمضان کی بعض راتوں میں نماز پڑھی جاتی ہے۔

جواب یہ ہے کہ درست ہے؛ کیوں کہ وہ منزلیں بھی مسجد ہی ہیں، علما نے لکھا ہے کہ ایک جگہ جب مسجد بن گئی، تو وہ جگہ تحت الثریٰ سے آسمان تک مسجد ہی ہے۔

چناں چہ ''درِمختار'' میں اور ''شامی'' میں اس کی تصریح موجود ہے۔(۱)

اور موجودہ صورتِ حال میں اوپر کی منزلیں اسی کی نیت سے بنائی جاتی ہیں کہ

---

(۱) قال: و کرہ تحریماً [الوطء فوقہ، والبول و التغوط] لأنہ مسجد إلی عنان السماء، و کذا إلیٰ تحت الثریٰ،(الدر المختار مع الشامي:۲/۴۲۸)

وہاں نماز پڑھی جائے؛ لہٰذا اس کے مسجد ہونے میں شبہ نہیں؛ اس لیے اعتکاف کرنا بھی وہاں درست ہے۔

اس سلسلے میں یہ سوال بھی پیش آتا ہے کہ نیچے کے حصے میں اعتکاف کرنے والا، اگر پہلی یا دوسری منزل پر گیا، تو اس کا اعتکاف باقی ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ اس کا اعتکاف برقرار ہے؛ کیوں کہ وہ مسجد ہی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ گیا ہے اور اس کی دلیل فقہ کا یہ صریح جزئیہ ہے کہ مسجد کی چھت پر چڑھنے سے اعتکاف باطل نہیں ہوتا۔ (۱)

مسجد کے تہہ خانے میں اعتکاف

آج کل مسجدیں جس طرح اوپر کی طرف کئی کئی منزلوں میں بن رہی ہیں، اسی طرح بعض مسجدوں میں نیچے کی طرف بھی مسجد کے لیے جگہ بنادی جاتی ہے، جہاں عام طور پر پنج وقتہ نماز نہیں ہوتی؛ البتہ بعض اوقات وہاں بھی نمازِ با جماعت کا اہتمام ہوجاتا ہے، مثلاً جمعہ میں، رمضان، شبِ برأت اور شبِ قدر میں؛ اس تہہ خانے اور نچلے حصے میں بھی اعتکاف کرنا درست ہے؛ کیوں کہ جیسا کہ اوپر گزرا، مسجد جہاں بنادی جاتی ہے، وہاں تحت الثریٰ سے آسماں تک مسجد ہی ہے اور یہاں تو باقاعدہ مسجد ہی کی نیت سے نیچے تہہ خانہ بھی بنایا جاتا ہے؛ اس لیے اس جگہ بھی اعتکاف کرنا درست ہے، اگرچہ پنج وقتہ نماز وہاں نہ ہوتی ہو؛ کیوں کہ یہ اس مسجد سے الگ نہیں ہے، جس کا یہ تہہ خانہ ہے؛ بل کہ اسی مسجد کا ایک حصہ ہے۔

مسجد کے اوپر اور نیچے کی منزلوں سے آکر جماعت میں شامل ہونا

جن مساجد میں کئی منزلہ عمارت ہوتی ہے، وہاں ایک منزل میں جماعت ہوتی

(۱) قال: ولا يبطل الإعتكاف بالصعود إليه، (الشامي: ۲/ ۴۲۸)

ہے، تو ایسی صورت میں اعتکاف کرنے والا اگر مسجد کے اوپر یا نیچے کی منزل میں اعتکاف میں بیٹھا ہے، تو اس کو پنج وقتہ نمازوں یا تراویح کی جماعت کے لیے جماعت خانے میں آکر شامل ہونا درست ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر دیگر منزلوں سے جماعت خانے میں آنے کے لیے راستہ مسجد کے اندر ہی سے ہو، تو ظاہر ہے کہ معتکف کا جماعت خانے میں آنا جائز ہے اور اس سے اعتکاف پر کوئی اثر نہیں پڑتا؛ لیکن اگر راستہ مسجد کے اندر سے نہ ہو؛ بل کہ باہر سے ہو، تو کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں احقر نے اس کتاب کی سابقہ اشاعتوں میں لکھا تھا کہ یہ بھی جائز ہے اور اس سے اعتکاف فاسد نہیں ہوگا اور اس کی وجہ یہ لکھی تھی کہ

"حاجتِ طبعیہ وحاجتِ شرعیہ کے لیے مسجد سے نکلنے کی اجازت دی ہے اور جماعت میں شامل ہونا حاجتِ شرعیہ ہے اور اس پر حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ایک فتوے کی عبارت سے استدلال کیا تھا، کسی نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے سوال کیا ہے کہ "جماعت مسجد کے صحن میں ہو رہی ہو، تو معتکف مسجد سے باہر یہاں آکر جماعت میں شامل ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں آپ رحمہ اللہ نے تصریح فرمائی ہے کہ

"ادراکِ جماعت مثلِ ادراکِ جمعہ ضرورتِ دینیہ ہے، اس لیے خروج جائز ہے"۔ (۱)

اس سے بندے نے استدلال کرتے ہوئے لکھا کہ "لہٰذا جماعت میں شامل ہونے کے لیے اس شخص کو باہر نکل کر مسجد کے جماعت خانے میں داخل ہونا درست ہے، اس سے اس کا اعتکاف فاسد نہ ہوگا"۔

(۱) امداد الفتاویٰ: ۱۵۲/۲

مگر بعد میں بنگلور کی ایک مسجد ''مسجدِ سر اسماعیل سیٹھ، فریزر ٹاؤن'' کے ایک استفتا کے جواب کے دوران دوبارہ اس مسئلے پر غور کرتے ہوئے، ہمارے جامعہ کے مفتیانِ کرام کو اس پر شبہ پیدا ہو گیا اور اس شبہے کی بنیاد یہ تھی کہ حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہ کے فتوے میں معتکف کو مسجد کے اندر سے باہر آ کر جماعت میں شرکت کی اجازت دی گئی ہے؛ کیوں کہ جماعت صحنِ مسجد میں ہو رہی تھی؛ لہٰذا اس ضرورتِ شرعیہ کی وجہ سے کہ مسجد میں جب جماعت نہیں ہو رہی ہے، باہر ہو رہی ہے اور اس میں شامل ہونا شرعی ضرورت ہے، یہ جائز ہوا؛ لیکن ہم اب جس مسئلے میں بحث کر رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ جماعت مسجد میں ہو رہی ہے اور معتکف بھی مسجد کے اندر ہے؛ البتہ جماعت کسی منزل پر ہو رہی ہے اور معتکف کسی اور منزل پر ہے، تو یہاں معتکف کو باہر آنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؛ کیوں کہ وہ جس منزل پر ہے، وہیں وہ نماز باجماعت میں شامل ہو سکتا ہے۔

الغرض! اس شبۂ قویہ کی وجہ سے ہم نے یہ فتویٰ دیا کہ راستہ اگر باہر سے ہو، تو مسجد کی کسی اور منزل سے جماعت میں شامل ہونے کے لیے باہر کے راستے سے آنا جائز نہیں اور اس سے اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے؛ لہٰذا صورتِ مسئلے میں جواب یہ ہے کہ ''باہر راستہ ہونے کی صورت میں نماز اسی منزل میں پڑھ لینا چاہیے، جہاں معتکف اعتکاف میں ہے، باہر کے راستے سے آ کر جماعت میں شامل ہونے سے اعتکاف فاسد ہو جائے گا''۔

معتکف کا اذان دینے کے لیے باہر نکلنا

اعتکاف کرنے والا شخص اذان دینے کے لیے مسجد سے باہر نکل سکتا ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں ملحوظ رہے کہ اگر اعتکاف کرنے والا یہ شخص اس مسجد کا مؤذن ہے،

توبہ اتفاقِ علما اس کو مسجد سے نکلنا درست ہے، اس سے اس کا اعتکاف فاسد نہ ہوگا۔

"**الجوهرة النيرة**" میں ہے:

" ولو كان المؤذن هو المعتكف، فصعد المأذنة للأذان لا يفسد اعتكافه، ولو كان بابها خارج المسجد ".

ترجمہ: اگر مؤذن ہی اعتکاف کرنے والا ہے اور وہ اذان دینے منار پر چڑھے، تو اس کا اعتکاف فاسد نہ ہوگا؛ اگرچہ اس کا دروازہ مسجد سے باہر ہو۔(۱)

اور اگر اعتکاف کرنے والا مؤذن نہیں ہے، تو اس میں اختلاف ہے کہ وہ اذان دینے کے لیے نکل سکتا ہے یا نہیں؟ بعض کہتے ہیں کہ غیر مؤذن اذان دینے باہر نکلے گا، تو اس کا اعتکاف فاسد ہو جاتا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ فاسد نہ ہوگا؛ مگر علامہ شامی اور ابن نجیم اور قاضی خان رحمہم اللہ نے لکھا ہے کہ پہلا قول ضعیف ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس میں مؤذن اور غیرِ مؤذن میں کوئی فرق نہیں ہے؛ یعنی کوئی بھی مسجد سے باہر نکل کر اذان دے، تو اس کا اعتکاف فاسد نہ ہوگا۔(۲)

مسجد کے بیت الخلا ہوتے ہوئے، قضائے حاجت کے لیے گھر جانا

حضراتِ فقہا نے اعتکاف کرنے والے کو قضائے حاجت کے لیے گھر جانے کی اجازت دی ہے؛ حتی کہ اگر راستے میں کسی عزیز دوست کا گھر ہو، تب بھی اپنے

---

(۱) الجوهرة النيرة :۱/۲۱۳

(۲) قال: [لومؤذناً]هذا قول ضعيف ، والصحيح أنه لا فرق بين المؤذن وغيره،(الدرالمختارمع الشامي:۳/۴۳۶.) فقال: أما في غير المؤذن ، فيفسد الاعتكاف والصحيح أن هذا قول الكل في حق الكل ؛ لأنه خرج لإقامة سنة الصلاة وسنتها تقام في موضعها فلا تعتبر خارجاً. (البحرالرائق :۲/۵۲۹)

گھر جانے کی اجازت دی ہے۔(۱)

لیکن یہ اس وقت کی بات ہے، جب کہ مسجدوں سے متصل آج کل کی طرح بیت الخلا کا انتظام نہ تھا، اب جب کہ تقریباً شہر کی ہر مسجد سے ملے ہوئے بیت الخلا بنے ہوئے ہیں اور پانی کا بھی معقول انتظام ہوتا ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معتکف مسجد کے بیت الخلا کو چھوڑ کر قضائے حاجت کے لیے اپنے گھر جا سکتا ہے یا نہیں؟

اس سے پہلے کہ اس کا حکم معلوم کریں، یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ فقہا نے لکھا ہے کہ اگر کسی آدمی کے دو گھر ہوں، ایک دور ہو اور ایک قریب اور یہ آدمی اعتکاف میں قریب کے گھر کو چھوڑ کر دور کے گھر کو جائے، تو بعض علما کے نزدیک اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا اور بعض کے نزدیک فاسد نہ ہوگا۔(۲)

علامہ شامی رحمہ اللہ نے " النهر الفائق " کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ اس صورت پر زیرِ بحث مسجد کے بیت الخلا چھوڑ کر گھر جانے کی صورت کو قیاس کرنا چاہیے؛ لہٰذا بعض کے نزدیک اس میں بھی اعتکاف فاسد ہو جائے گا اور بعض کے نزدیک فاسد نہ ہوگا، مگر آگے چل کر علامہ شامی رحمہ اللہ نے "رحمتي" کے حوالے سے ان دونوں صورتوں میں ایک فرق بیان کر کے مسجد کے بیت الخلا چھوڑ کر گھر جانے کی صورت کو بالاتفاق جائز قرار دیا ہے، فرق یہ ہے کہ بعض لوگوں کو اپنے گھر کے علاوہ دوسرے کے گھر سے انس نہیں ہوتا اور قضائے حاجت آسانی

---

(۱) قال: ولو كان بقرب المسجد بيت صديق لهٗ ، لم يلزم قضاء الحاجة فيه .

(عالمگیری:۱/۲۳۳)

(۲) قال: واختلف فيما لو كان له بيتان فأتىٰ البعيد منهما ،قيل : فسد، وقيل: لا (الشامي: ۳/۴۳۵) قال:وإن كان له بيتان قريب وبعيد فقال بعضهم : لايجوز أن يمضي إلى البعيد، فإن مضي بطل اعتكافه. (عالمگیری:۱/۲۳۳)

سے نہیں ہوتی؛ اس لیے اس صورت میں بالاتفاق اعتکاف فاسد نہ ہونا چاہیے۔(۱)

اس لیے کہ اگر کسی کو مسجد کے بیت الخلا سے وحشت ہوتی ہو، تو اس کے لیے گھر جانے کی گنجائش ہوگی؛ مگر فراغت کے فوراً بعد واپس آجانا چاہیے، ورنہ اعتکاف فاسد ہو جائے گا۔(۲)

معتکف کا گرمی اور جمعہ کے غسل کے لیے باہر نکلنا

حالتِ اعتکاف میں جمعہ کے غسل یا گرمی کی شدت کی وجہ سے غسل کرنے کے لیے مسجد سے باہر نکلنا درست نہیں ہے؛ کیوں کہ اعتکاف میں صرف دو صورتوں میں مسجد سے نکلنے کی اجازت ہے: ایک حاجتِ طبعیہ کے لیے اور دوسرے حاجتِ شرعیہ کے لیے اور گرمی کا غسل نہ حاجتِ شرعیہ میں داخل ہے نہ حاجتِ طبعیہ میں حاجتِ شرعیہ میں داخل نہ ہونا تو ظاہر ہے، اسی طرح جمعہ کا غسل حاجتِ شرعیہ میں داخل نہ ہونا بھی ظاہر ہے؛ کیوں کہ یہ فرض نہیں ہے اور نہ واجب ہے؛ البتہ گرمی کے لیے غسل اور جمعہ کے لیے غسل کو ممکن ہے کہ حاجتِ طبعیہ میں داخل سمجھ کر اس کے لیے مسجد سے نکلنے کی گنجائش نکالیں، اس لیے اس کو یہاں ذکر کرنا پڑا۔

سو معلوم ہونا چاہیے کہ گرمی کا غسل حاجتِ طبعیہ میں بھی داخل نہیں ہے؛ کیوں کہ حضراتِ فقہا نے حاجتِ طبعیہ کی تعریف یہ کی ہے کہ

---

(۱) قال: وينبغي أن يخرج على القولين، مالو ترک بيت الخلاء للمسجد القريب و أتى بيته .(نهر).ولا يبعد الفرق بين الخلافية وهذه ، لأن الإنسان قدلايألف غير بيته .رحمتي:أي فإذا كان لا يألف غيره بأن لا يتيسرله إلا في بيته فلا يبعد الجواز بلا خلاف. (الشامي:۳/۴۳۵)

(۲) قال: ويرجع إلى المسجد كما فرغ من الوضوء ، ولومكث في بيته فسد اعتكافه و إن كان ساعةً . (عالمگیری:۱/۲۳۳)

" الطبيعية ما لابدمنها وما لا يقضى في المسجد ".

ترجمہ: حاجتِ طبعیہ وہ ہے، جس کے بغیر چارہ نہ ہو اور اس کو مسجد میں پورا نہ کیا جا سکتا ہو۔[1]

اور ظاہر ہے کہ گرمی کا غسل ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو؛ بل کہ گرمی سے بچنے کے لیے اور ٹھنڈک حاصل کرنے کے لیے اور بھی طریقے ہیں، مثلاً: پنکھا کرنا، بھیگا ہوا کپڑا سر یا بدن پر ڈال لینا وغیرہ؛ اس لیے علما نے ٹھنڈک کے لیے غسل کو حاجتِ طبعیہ میں داخل نہیں فرمایا، چناں چہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے "امداد الفتاوی" میں غسلِ تبرید کے لیے باہر نکلنے کو مفسد قرار دیا ہے۔[2]

اس لیے ایسا نہ کرنا چاہیے اور یہی حال ہے جمعہ کے غسل کا، کہ وہ حاجتِ طبعیہ میں بھی داخل نہیں؛ لہٰذا اس کے لیے مسجد سے نکلنا مفسدِ اعتکاف ہے۔

البتہ اگر گرمی کے دنوں میں اعتکاف کا موقعہ آئے اور وہ پہلے ہی نیت کر لے کہ میں گرمی کے غسل کے لیے نکلوں گا، تو اس کے لیے نکلنے کی گنجائش ہو سکتی ہے، جیسے فقہا نے نذر کے اعتکاف میں لکھا ہے کہ

اگر نذر کے وقت نیت کر لیا کہ مریض کی عیادت یا نمازِ جنازہ کے لیے یا علم کی مجلس میں شرکت کے لیے نکلوں گا، تو اس کا اعتکاف فاسد

---

(۱) الشامي: ۳/۴۳۵

(۲) چناں چہ سوال ہوا کہ: گرمی کی وجہ سے غسل خانے میں جا کر روزانہ نہانا جائز ہے؟
الجواب: نہیں۔ سوال: اگر بہ وجہ ناواقفیت کے نہایا ہو، تو اس کا اعتکاف ہوا یا نہیں؟
الجواب: جتنے دن ایسا کیا ہے، اتنے دن کے اعتکاف کی قضا کرے۔
(امداد الفتاوی: ۲/۱۵۳-۱۵۴)

نہ ہوگا۔(۱)

مگر چونکہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم سے اس طرح نکلنا ثابت نہیں ہے؛ اس لیے یہ خلافِ سنت ہے؛ البتہ اعتکاف فاسد نہ ہوگا۔

معتکف کا مسجد میں پان کھانا

اعتکاف کرنے والا مسجد میں پان استعمال کرسکتا ہے؛ کیوں کہ پان مباح چیز ہے اور مباح چیز کا استعمال مسجد میں معتکف کے لیے جائز ہے، ہدایہ میں ہے کہ

" وأما الأكل والشرب والنوم يكون في معتكفه ". (۲)

ترجمہ: معتکف کا کھانا پینا اور سونا اس کے اعتکاف کی جگہ (مسجد) میں ہوگا۔

پان میں اگر تمباکو استعمال کرے، تو دیکھا جائے گا کہ وہ تمباکو کیسا ہے، اگر بدبودار ہے، تو اجازت نہ ہوگی اور بدبودار نہ ہو، تو اجازت ہوگی۔(۳)

معتکف کا مسجد میں بیڑی، سگریٹ، حقہ استعمال کرنا

مسجد میں چوں کہ بدبودار چیزوں کا لانا، رکھنا، استعمال کرنا سب ناجائز ہے؛

---

(۱) قال: لوشرط وقت النذر، أن يخرج لعيادة مريض، وصلاة جنازة، وحضور مجلس علم ؛ جاز ذلک . (الدرالمختارمع الشامي :۳/۴۳۹)

قال: لوشرط وقت النذر والالتزام أن يخرج إلیٰ عيادة المريض وصلاة الجنازة وحضورمجلس العلم ،يجوز لہٗ ذٰلک. (عالمگیری:۱/۲۳۴)

(۲) الهداية:۲/۲۹۳، عالمگیری:۱/۲۳۴

(۳) تمباکو کی کئی قسمیں ہیں: بعض میں نشہ یا بدبو ہے، ان کا استعمال، تو کسی صورت جائز نہیں اور بعض میں یہ بات نہیں، تاہم مضرت شدیدہ سے خالی نہ ہونے کی وجہ سے اس قسم کے تمباکو کا استعمال بھی کراہت سے خالی نہیں؛ لہٰذا اس سے احتراز ہی اولیٰ و بہتر ہے۔

اس لیے معتکف کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ مسجد میں بیڑی، سگریٹ اور حقہ استعمال کرے؛ کیوں کہ ان چیزوں میں بھی بدبو ہوتی ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو شخص اس بدبودار درخت میں سے کچھ کھائے ؛یعنی پیاز اور لہسن، تو وہ ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے۔(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ بدبودار چیزوں کا مسجدوں میں لانا یا اس کا استعمال کرنا ناجائز ہے؛اسی سے علما نے لکھا ہے کہ مسجد میں مٹی کا تیل استعمال کرنا یا رکھنا ناجائز ہے؛ کیوں کہ اس میں بدبو ہوتی ہے۔(۲)

اب دیکھنا یہ ہے کہ بیڑی، سگریٹ اور حقے میں بدبو ہوتی ہے یا نہیں؟ممکن ہے، ان چیزوں کے عادی لوگوں کو اس کی بدبو،خوش بو سے زیادہ مرغوب معلوم ہو؛ مگر جو اس کے عادی نہیں ہیں،ان سے پوچھو کہ یہ کس قدر اذیت وتکلیف دہ چیزیں ہیں۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ " منیۃ الساجد "میں اوپر کی حدیث نقل کرکے فرماتے ہیں:

''مراد یہ ہے کہ جب تک اس (پیاز) کی بدبو منہ سے نہ جائے، اس وقت تک مسجد میں نہ داخل ہو اور یہی حکم ہر بدبودار چیز کا ہے،

---

(۱) عن جابربن عبد الله رضي الله عنه عن النبي صلى الله عليه وسلم ، قال: من أكل من هذه البقلة ، الثوم وقال مرة:من أكل البصل و الثوم والكراث فلا يقربن مسجدنا، فإن الملائكة تتأذى مما يتأذى منه بنو آدم .

(المسلم واللفظ له:۲۲۴،الرقم،۵۶۴،البخاري:ص،۱۷۳،الرقم ۸۵۴،السنن الكبرىٰ للنسائي:۱/۳۹۱،الرقم،۷۸۸)

(۲) منية الساجد :۱۰

جیسے: حقہ، سگریٹ اور لہسن وغیرہ۔" (۱)

غرض! بدبودار چیز کا مسجد میں استعمال، معتکف کے لیے بھی جائز نہیں۔

بیڑی، سگریٹ، حقے کے لیے مسجد سے باہر نکلنا

بیڑی، سگریٹ، حقے کے لیے مسجد سے باہر نکلنا درست ہوگا یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں! کیوں کہ جیسا اوپر تفصیل سے گذر چکا ہے کہ معتکف صرف دو صورتوں میں مسجد سے نکل سکتا ہے، ایک حاجتِ طبعیہ کے لیے، دوسرے حاجتِ شرعیہ کے لیے اور یہ بھی اوپر گذر چکا کہ حاجتِ طبعیہ اس کو کہتے ہیں، جس کے بغیر چارہ نہ ہو اور یہ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں اس تعریف میں داخل نہیں ہیں؛ کیوں کہ یہ چیزیں ہماری اپنی عادت سے لازمہ بنالی جاتی ہے، نہ کہ طبیعت سے؛ اس لیے ان چیزوں کے لیے باہر نکلنا درست نہ ہوگا۔ مفتی عزیز الرحمان صاحب رحمہ اللہ نے "فتاویٰ دارالعلوم" میں صاف لکھا ہے کہ

"باہر نکلنا بہ غرضِ حقہ نوشی جائز نہ ہوگا"۔ (۲)

البتہ ایسے لوگوں کو جو اس قسم کی چیزوں کے عادی ہیں، چاہیے کہ بیت الخلا جاتے وقت ان کا استعمال کریں اور مسجد میں داخل ہونے سے پہلے منہ کو اچھی طرح صاف کرلیں۔ ہاں! اگر ایسا عادی ہو چکا ہے کہ ان چیزوں کے ترک سے طبیعت خراب ہونے کا خوف ہو، تو پھر ان چیزوں کو حاجتِ طبعیہ میں شمار کیا جائے گا اور اس حالت میں ان چیزوں کے استعمال کے لیے مسجد سے نکلنے سے اعتکاف فاسد نہ ہوگا؛ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ ان چیزوں کے استعمال کے بعد منہ سے بدبو زائل کر کے

---

(۱) منیۃ الساجد:۱۰

(۲) فتاویٰ دارالعلوم:۶/۵۰۵

مسجد میں آئیں۔ (۱)

ہر محلے میں اعتکاف سنت ہے

رمضان کے عشرۂ اخیرہ کا اعتکاف سنتِ مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔ (۲)

ابن عربی نے کہا کہ یہ ''سنتِ مؤکدہ'' ہے اور ابن بطال نے فرمایا کہ ''نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے اس پر پابندی فرمانے میں اس پر دلیل ہے کہ یہ تاکیدی سنت ہے'' اور ابو داؤد نے امام احمد سے نقل کیا کہ ''میں اس کے مسنون ہونے میں علما میں سے کسی کا اختلاف نہیں جانتا''۔ (۳)

سنتِ کفایہ کا مطلب یہ ہے کہ چند لوگ بھی اس کو ادا کر دیں گے، تو سب کی طرف سے ساقط ہو جائے گا اور اگر کوئی بھی ادا نہ کرے، تو سب گنہ گار ہوں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں جہاں کثیر آبادی ہوتی ہے اور سیکڑوں مساجد ہوتی ہیں، وہاں کیا ہر محلے کی مسجد میں کوئی نہ کوئی اعتکاف کرے یا شہر میں کسی بھی مسجد میں کسی کے اعتکاف کر لینے سے شہر والوں سے ساقط ہو جائے گا؟

---

(۱) چناں چہ حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب رَحِمَہُ اللہُ رقم فرماتے ہیں کہ

اعتکاف کرنے سے پہلے ہی بیڑی چھوڑنے کی کوشش کرے، اگر اس میں کامیابی نہ ہو، تو تعداد اور مقدار کم کرے اور کچھ پینی ہی پڑے، تو جس وقت استنجا اور طہارت کے لیے نکلے، اس بیڑی کی حاجت بھی پوری کرے، خاص بیڑی پینے کے لیے نہ نکلے؛ مگر جب مجبور ہو جائے اور طبیعت خراب ہونے کا خوف ہو، تو اس کے لیے بھی نکل سکتا ہے کہ ایسی اضطراری حالت کے وقت یہ طبعی ضرورت میں شمار ہوگا اور مخل و مفسدِ اعتکاف نہ ہوگا۔ (فتاویٰ رحیمیہ: ۷/۲۷۷-۲۷۸)

(۲) قال: [وسنة مؤكدة في العشر الأخير من رمضان] أي سنة كفاية.
(الدر المختار مع الشامي: ۳/۴۳۰)

(۳) فتح الباري: ۴/۲۷۲

اس سلسلے میں فقہائے کرام سے کوئی تصریح نہیں ملی؛ البتہ شامی رحمہ اللہ نے اعتکاف کو تراویح کی نظیر بتایا ہے۔(۱)

اور تراویح کی جماعت کے بارے میں تین قول بیان کیے ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ شہر کی ہر مسجد میں اقامتِ تراویح ہونا چاہیے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ شہر کی کسی ایک مسجد میں کافی ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ ہر محلے کی مسجد میں ہونا چاہیے، علامہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ صاحبِ درمختار کے کلام سے پہلی بات ظاہر ہوتی ہے اور طحطاوی رحمہ اللہ نے دوسرے قول کو ظاہر قرار دیا ہے؛ مگر میرے نزدیک تیسرا قول ظاہر ہے کہ ہر محلے کی مسجد میں اقامتِ تراویح سے سنتِ کفایہ ادا ہوگی۔(۲)

اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہر کی ہر مسجد میں ہو، تو بہت خوب؛ ورنہ کم از کم ہر محلے کی کسی ایک مسجد میں تو اعتکاف ہونا چاہیے اور یہ اس طرح بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ہر محلّہ ایک گاؤں کی طرح ہوتا ہے؛ لہٰذا ہر محلے کی مسجد میں ہونا چاہیے۔

معتکف کا حجامت بنوانا

معتکف کو اگر حجامت بنوانے کی ضرورت پیش آجائے، تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اس کے لیے مسجد سے باہر جانا مفسدِ اعتکاف ہے؛ اس لیے اس کی خاطر باہر نہیں جا سکتا۔(۳)

---

(۱) قال: نظيرها إقامة التراويح بالجماعة ،(الشامي :۳/۴۳۰)

(۲) قال: وهل المراد أنها سنة كفاية لأهل كل مسجد من البلدة أو مسجد واحد منها أو من المحلة ؟ ظاهر كلام الشارح الأول ، واستظهره الثاني ، ويظهر لي الثالث .(الشامي :۲/۴۹۵)

(۳) چناں چہ حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ''معتکف کے لیے سر منڈانے اور غسلِ مستحب کے لیے مسجد سے نکلنا درست نہیں۔ (فتاویٰ رحیمیہ :۷/۲۷۷)

اورمسجد کے اندرہی حجامت بنوانا ہو،تو یہ درست ہے؛ مگراس میں تفصیل یہ ہے کہ اگرخود بنالے یا حجام بغیر مزدوری کے بنائے ،تو جائز ہے اوراگرمزدوری لے کر بنائے ،تو مسجد میں جائزنہیں ؛اس لیے ایسا کیا جائے کہ معتکف تو مسجد میں رہے اورحجام مسجد سے باہر بیٹھ کرحجامت بنائے۔(۱)

لیکن ہرصورت پراس کا اہتمام کرے کہ مسجد بالوں سے آلودہ نہ ہو؛اس لیے کہ مسجدکوصاف ستھرا رکھنے کی تاکید کی گئی ہے،اس لیے حجامت بنانے سے قبل، کپڑا وغیرہ بچھالے،تاکہ گرنے والے بال مسجد کے فرش پرنہ گریں۔(۲)

معتکف کا ڈاڑھی بنوانا

معتکف کے ڈاڑھی بنانے میں بھی یہی تفصیل ہے کہ اس کے لیے مسجد کے باہر جانا جائزنہیں ،اگر جائے گا،تو اعتکاف ٹوٹ جائے گا اور اگر مسجد میں بنائے تو، درست ہے؛ مگرحجام کے ذریعے بنوانے میں تفصیل یہ ہے کہ اجرت پر یہ معاملہ مسجد کے اندرنا جائز ہےاور بلا اجرت ہو،تو جائز ہے؛ ہاں! حجام مسجد کے باہر بیٹھ کرڈاڑھی بنائے اورمعتکف مسجد میں ہو،تو درست ہے۔(۳)

---

(۱) چناں چہ حضرت مفتی عبدالرشید صاحب لدھیانوی رَحِمَہُ اللہُ لکھتے ہیں کہ ''اپنی حجامت خود بنانا جائز ہےاورحجام سے بنوانے میں یہ تفصیل ہے کہ اگروہ بدونِ عوض کام کرتا ہے،تو مسجد کے اندرجائز ہے اور اگر بالعوض ہے،تو معتکف مسجد کے اندررہے؛ مگرحجام مسجد سے باہر بیٹھ کر حجامت بنائے ،مسجد کے اندراجرت سے کام کرنا جائزنہیں۔ (احسن الفتاویٰ:۴/۵۱۶)

(۲) چناں چہ حضرت مفتی عبدالرحیم صاحب لاجپوری رَحِمَہُ اللہُ لکھتے ہیں کہ ''سرمنڈانا ضروری ہو،تواعتکاف کی جگہ میں چادروغیرہ بچھا کرمنڈاسکتا ہے اور پوری احتیاط رکھے کہ بال وغیرہ مسجد میں گرنے نہ پائیں۔ (فتاوی رحیمیہ:۷/۲۷۷)

(۳) دیکھیے حوالۂ سابق دربیان: ''معتکف کا حجامت بنوانا''

یہاں اس سلسلے میں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہ کہ ڈاڑھی بنانے سے مراد یہ ہے کہ ڈاڑھی کو درست کیا جائے یا گالوں پر اگنے والے بالوں کی صفائی کی جائے، اس سے ڈاڑھی منڈانا یا ایک مشت سے کم رکھنا مراد نہیں، ڈاڑھی کا منڈانا اور ایک مشت سے کم کرنا ہر صورت میں حرام ہے۔(۱)

لہٰذا مسجد کے اندر اور حالتِ اعتکاف میں یہ کام کرنا سخت حرام و ناجائز ہوگا، اگرچہ اس سے اعتکاف فاسد نہیں ہوتا؛ مگر اس کا ارتکاب گنہ گار بنا دیتا ہے۔

حالتِ اعتکاف میں بیمار ہو جائے تو؟

حالتِ اعتکاف میں اگر کوئی شخص بیمار ہو جائے، تو اولاً اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ مسجد ہی میں رہتے ہوئے علاج ہو جائے، مثلاً مسجد ہی میں کسی ڈاکٹر کو بلا کر معائنہ کرائے اور علاج کرائے، اگر اس سے افاقہ نہ ہو یا یہ صورت نہ بن سکے، تو اس کی گنجائش ہے کہ وہ گھر چلا جائے یا ڈاکٹر کے پاس جائے؛ مگر اس سے اس کا اعتکاف فاسد ہو جائے گا؛ مگر چوں کہ مجبوری سے ایسا کیا ہے، لہٰذا گنہ گار نہ ہوگا اور اس پر بعد میں قضا کرنا ضروری ہوگی، قاضی خاں رحمہ اللہ نے فرمایا ہے:

" إذا خرج ساعةً بعذر المرض لم يصر مستثنى عن الإيجاب؛ لأنه لا يغلب و قوعهٗ فصار كانهٗ خرج بغير عذر إلا أنهٗ لم يأثم في الخروج بعذر المرض "(۲)

---

(۱) ڈاڑھی منڈانا اور کترانا (جب کہ ایک مشت سے کم ہو) تمام فقہا کے نزدیک حرام اور گناہِ کبیرہ ہے اور داڑھی منڈانے اور کترانے والا فاسق اور گنہ گار ہے۔
(آپ کے مسائل اور ان کا حل: ۷/ ۸۷)

(۲) الخانية علىٰ هامش الهند: ۱/۲۲۳

اسی طرح شامی اور ابن نجیم رحمہما اللہ نے بھی لکھا ہے۔(۱)

غرض ایسی صورت میں نکلنا مفسدِ اعتکاف ہے؛ البتہ وہ گنہ گار نہ ہوگا، ہاں بعد میں قضا کر لینا چاہیے۔

روزے کے بغیر اعتکاف

اگر کوئی شخص مرض کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکا؛ مگر وہ اعتکاف کرنا چاہتا ہے، تو کیا بغیر روزے کے اعتکاف کرنا درست ہوگا؟

اس سلسلے میں علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ اعتکافِ مسنون کے لیے روزہ شرط نہیں ہے؛ کیوں کہ فقہائے کرام نے تصریح کی ہے ''روزہ صرف نذر کے اعتکاف میں شرط ہے''۔(۲)

مگر علامہ شامی نے اس سے اختلاف کیا ہے اور فرمایا کہ فقہا نے اعتکاف کی تین قسمیں قرار دی ہیں: واجب (نذر کا اعتکاف) سنت اور نفل اور واجب کے لیے روزے کو شرط قرار دیا ہے اور نفل کے لیے روزے کا شرط نہ ہونا بیان کیا ہے؛ مگر سنت اعتکاف سے کوئی تعرض نہیں فرمایا؛ کیوں کہ عادتاً یہ عشرۂ آخیر کا اعتکاف روزے ہی کے ساتھ ہوتا ہے؛ لہٰذا اعتکافِ مسنون میں بھی روزہ شرط ہونا چاہیے۔(۳)

---

(۱) البحر الرائق :۱/۳۰۳،الشامي:۲/ ۴۴۷

(۲) قال: لتصريحهم بأن الصوم إنما هو شرط في المنذورفقط، دون غيره. (البحر الرائق :۲/۵۲۴)

(۳) قال: وقوله في البحر: لا يمكن حمله عليه لتصريحهم بأن الصوم إنما هو شرط في المنذور فقط، دون غيره . فيه نظر؛ لأنهم إنما صرحوا بكونه شرطاً في المنذور غير شرط في التطوع ،..

اس کا حاصل یہ ہوا کہ جو شخص بیماری وغیرہ کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے، وہ اعتکافِ مسنون نہیں کرسکتا؛ کیوں کہ روزہ اس کے لیے بھی شرط ہے؛ البتہ ایسا شخص اعتکاف کرے، تو وہ نفلی اعتکاف کا ثواب پائے گا۔

.... و سکتوا عن بیان حکم المسنون لظهور أنهٗ

لایکون إلا بالصوم عادةً ،ولهذا قسم في متن الدر الاعتکاف إلیٰ الأقسام الثلاثة : المنذور والمسنون والتطوع ، ثم قال : والصوم شرط لصحة الأول لاالثالث ، ولم یتعرض للثاني لما قلنا. (الشامي :۳/۴۳۱)

تراویح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تراویح

تراویح پر اجرت کا مسئلہ

آج کل تراویح میں قرآن سنانے پر اجرت لینے دینے کا رواج عام ہوگیا ہے اور اس قدر اس کا شیوع ہے کہ آج اس مسئلے پر کچھ کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے؛ مگر اہلِ انصاف سے حق کے قبول کرنے کی توقع پر کچھ کہنے کی ہمت ہوتی ہے۔

حضراتِ فقہا نے عبادات پر اجرت لینے کو حرام قرار دیا ہے اور یہی احناف کا مذہب ہے؛ چناں چہ کتبِ فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

صاحبِ ہدایہ فرماتے ہیں:

" والأصل عندنا أن كل طاعة يختص بها المسلم لايجوز الاستيجار عليه "(۱)

ترجمہ: اصل یہ ہے کہ ہر وہ عبادت، جو مسلمان کے ساتھ خاص ہے، اس پر اجرت لینا، دینا جائز نہیں۔

"شرح الوقاية" میں ہے:

"والأصل عندنا أنه لا يجوز الإجارة على الطاعات و لا على المعاصي". (۲)

---

(۱) الهداية:۶/۲۹۶

(۲) شرح الوقاية: ۲۹۹

ترجمۃ: ہمارے نزدیک اصل یہ ہے کہ اجارہ جائز نہیں، نہ طاعات پر نہ گناہوں کے کام پر۔

اسی طرح درمختار، کنز الدقائق، قدوری وغیرہ کتبِ فقہ میں اس کی تصریح موجود ہے اور تراویح کا یا قرآن پڑھنے کا طاعت یا عبادت ہونا ظاہر ہے؛ اس لیے اس حرمت کے حکم میں وہ بھی داخل ہے، پس یہ اجرت لینے دینے کا رواج صریح حرام و ناجائز ہے۔(۱)

اور فقہائے احناف کا اس سلسلے میں مستدل احادیث ہیں، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن پڑھو، مگر اس کے ذریعے مت کھاؤ۔

ایک اور حدیث میں فرمایا کہ وہ شخص قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کا چہرہ صرف ہڈی ہی ہڈی ہوگا، جس پر گوشت نہ ہوگا۔(۲)

اب رہی یہ بحث کہ علما وائمۂ فقہ نے اذان، امامت، تعلیمِ قرآن وفقہ پر اجرت کو کیسے جائز قرار دیا اور اگر ان پر اجرت جائز ہے، تو پھر تراویح پر کیوں جائز نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حضراتِ ائمۂ فقہ نے ان بعض عبادات وطاعات کو حرمت کے اصل حکم سے ضرورت کی بنا پر الگ کیا ہے اور ان پر اجرت لینے

---

(۱) مختصر القدوري:۱۰۴ ، المبسوط للسرخسي :۱۶/ ۲۷، الشامي:۹/ ۷۶، كنز الدقائق: ۸/ ۳۳، مجمع الأنهر:۳/ ۵۳۲، الفتاویٰ الهندية :۴/ ۵۰۷، الاختيار لتعليل المختار:۲/ ۵۹)

(۲) عن عبدالرحمن بن شبل قال: إني سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم قال: اقرؤوا القرآن ولا تغلوا فيه ولا تجفوا عنه ولا تأكلوا به ولا تستكثروا به .
(مسند أبويعلیٰ: ۳/ ۸۸، الرقم، ۱۵۱۸، مجمع الزوائد:۴/ ۱۷۰ ، الرقم: ۶۴۴۵، اتحاف الخيره : ۶/ ۳۴۷، الرقم، ۵۹۹۷، نصب الراية :۴/ ۱۳۵ ، الرقم، ۶۸۱۸، الدراية:۲/ ۱۸۸، الرقم:۸۶۶)

دینے کو جائز قرار دیا ہے، ضرورت یہ ہے کہ ''ان چیزوں پر اجرت نہ دی جائے، تو یہ اہم فرائض وشرائعِ اسلام ضائع ہو جائیں گے۔''

چناں چہ ''ہدایہ'' میں تعلیمِ قرآن پر اجرت کے جواز کا قول نقل کر کے فرمایا ہے کہ

یہ جائز؛ بل کہ اچھا اس لیے ہے کہ آج دینی امور میں سستی غالب ہے، پس اگر اجرت سے منع کریں، تو حفظِ قرآن ضائع ہو جائے گا۔(۱)

معلوم ہوا کہ قرآن کی حفاظت و حفظِ قرآن جیسے فریضے کی بقا کے واسطے تعلیمِ قرآن کو جائز قرار دیا ہے، اسی طرح امامت، اذان، وغیرہ پر اجرت کا جواز بھی اسی ضرورت کے پیشِ نظر ہے۔

چناں چہ علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

'' وقد اتفقت كلمتهم جميعاً في الشروح والفتاویٰ على التعليل بالضرورة .''

ترجمہ: تمام علما کا کلام اس پر متفق ہے کہ (ان چیزوں پر اجرت کے جواز) کی علت و وجہ ضرورت ہے؛ یعنی ضرورت کی وجہ سے اجرت کو جائز قرار دیا ہے۔(۲)

آگے چل کر بہت صاف بات کہتے ہیں کہ

تمام مشائخ کا کلام اس پر متفق ہے کہ اصل مذہب عدمِ جواز ہے، پھر ان حضرات نے ان چیزوں کا استثنا کیا ہے، جو تم معلوم کر چکے،

---

(۱) قال: وبعض مشائخنا استحسنوا الاستئجار على تعليم القرآن اليوم ؛ لأنه ظهر التواني في الأمور الدينية ، ففي الامتناع يضيع حفظ القرآن وعليه الفتویٰ. (الهداية:۶/۲۹۶)

(۲) ردالمحتار:۹/۷۶

پس یہ قطعی اور روشن دلیل ہے، اس بات کی کہ ہر طاعت پر اجرت
لینے کے جواز پر فتویٰ نہیں ہے؛ بل کہ فتویٰ صرف ان چیزوں پر ہے،
جو مذکور ہوئے، جن میں ضرورت پائی گئی۔ ''(۱)

اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ ہر طاعت پر اجرت لینا جائز نہیں ہے اور نہ علما نے اس پر فتویٰ دیا ہے؛ بل کہ فتویٰ صرف ان چیزوں پر اجرت لینے کے جواز کا ہے، جو فقہا کے کلام میں مذکور ہے اور ان میں ''تراویح نہیں ہے'' اور تراویح میں ویسی ضرورت بھی متحقق نہیں ہے؛ کیوں کہ تراویح میں قرآن سنانا فرض وشعار نہیں ہے؛ بل کہ سنت ہے؛ لہٰذا اگر یہ ترک بھی ہو جائے، تو سنت کا ترک تو لازم آئے گا، فرض و شعارِ اسلامی کا ترک لازم نہیں آئے گا؛ اس لیے اس پر اجرت جائز نہیں ہے۔

اب رہی یہ بات کہ اس کو اجرت کے بہ جائے ''ہدیہ'' کہا جائے تو؟

عرض ہے کہ ہدیے میں جبر واکراہ نہیں ہوتا اور اس میں جبر ہوتا ہے؛ یہ کیسا ہدیہ ہے؟

بعض کہتے ہیں کہ ہم شرط نہیں لگاتے اور بلا شرط یہ جائز ہے؛ مگر یہ بھی غلط ہے؛ کیوں کہ فقہ کا قاعدہ ہے ''**المعروف کالمشروط**'' کہ جو عرف میں رائج ہو، وہ ایسا ہے، جیسے شرط کیا ہوا ہو؛ لہٰذا جب تراویح پر دینے لینے کا رواج ہے، تو وہ شرط ہی کی طرح ہے؛ اس لیے کہ شرط نہ کرنے سے بھی یہ اجرت جائز نہیں ہوتی۔

بعض نے یہ بھی حیلہ بیان کیا ہے کہ پنج وقتہ نمازوں میں سے ایک دو وقت کی امامت بھی تراویح کے ساتھ کر لے، تو اجرت لینا درست ہے؛ مگر یہ بھی صحیح نہیں؛

---

(۱) **قال: وقداتفقت کلمتھم جمیعاً علی التصریح بأصل المذھب من عدم الجواز ، ثم استثنوا بعدہٗ ما علمتہ فھذا دلیل قاطع وبرھان ساطع علیٰ أن المفتیٰ بہٖ لیس ھو جواز الاستئجار علی کل طاعۃ ، بل علی ما ذکروہ فقط مما فیہ ضرورۃ ظاھرۃ.** (الشامي:۹/۷٦)

کیوں کہ ہر کام اس کے مقصد کے لحاظ سے صحیح یا غلط ہوتا ہے اور یہاں چوں کہ امامت مقصود نہیں؛ بل کہ تراویح میں قرآن سنانا مقصد ہے، اس لیے مقصد ہی کا اعتبار کریں گے، امامت کا نہیں اور اس مقصد پر اجرت درست نہیں۔

الغرض! اس کے جواز کی کوئی صورت نہیں ہے؛ اس لیے اس سے احتراز کرنا چاہیے، اس مسئلے پر تفصیلی کلام احقر کے رسالے ''منکراتِ رمضان'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔(۱)

نابالغ کی اقتدا، تراویح میں

نابالغ حافظِ قرآن کی اقتدا میں نمازِ تراویح پڑھنا درست نہیں ہے۔ تراویح میں نابالغ کی اقتدا کا مسئلہ اگر چہ اختلافی ہے کہ بعض مشائخ نے اس کی اجازت دی ہے اور بعض نے اس کو نا درست قرار دیا ہے؛ لیکن صحیح اور مختار قول یہی ہے کہ ''نابالغ کی اقتدا، کسی نماز میں بھی درست نہیں''۔

صاحب ''ہدایہ'' فرماتے ہیں:

---

(۱) البتہ جو حفاظ تراویح پر اجرت نہیں لیتے اور آمد و رفت رکھتے ہیں یا قیام وطعام بھی کرتے ہیں، تو ان کی آمد و رفت اور قیام وطعام کے انتظام کا ذمہ، ذمہ دارانِ مسجد پر عائد ہوگا؛ چناں چہ اسی مسئلے کی بابت، حضرت اقدس سے سوال ہوا کہ

ہماری مسجد میں ایک حافظ صاحب قرآن پاک تراویح میں سناتے ہیں اور اس پر کوئی اجرت یا ہدیہ نہیں لیتے، مگر وہ دور سے آتے جاتے ہیں اور اسکوٹر (Scooter) سے آمد و رفت کرتے ہیں، تو کیا ان کے آمد و رفت کا خرچ مسجد والوں کے ذمے ہے اور کیا یہ دینا جائز ہے؟ اس پر آپ نے تحریر فرمایا کہ

''حافظِ قرآن کو آمد و رفت کا خرچ دینا، مسجد کے ذمہ داروں کی ذمہ داری ہے اور یہ دینا بلاشبہ جائز ہے، اس کو اجرت نہیں سمجھا جائے گا۔''

"وفي التراويح والسنن المطلقة جوّزهُ مشايخ بلخ، ولم يجوّزه مشايخنا. والمختار أنهُ لايجوز في الصلوات كلها.(۱)

ترجمۃ: اور تراویح وسنتِ مؤکدہ میں "بلخ" کے مشائخ نے (نابالغ کی اقتدا) کو جائز قرار دیا ہے اور ہمارے مشائخ نے اس کی اجازت نہیں دی ہے اور مختار قول یہ ہے کہ (نابالغ کی اقتدا) تمام نمازوں میں نادرست ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسئلہ اگر چہ اختلافی ہے؛ مگر صحیح اور مختار قول یہی ہے کہ کسی بھی نماز میں نابالغ کی اقتدا درست نہیں، درمختار میں بھی اسی کو صحیح، بل کہ اصح قرار دیا ہے۔(۲)

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے بھی اسی پر فتویٰ دیا ہے۔ چناں چہ فرماتے ہیں:

" فتویٰ اس پر ہے کہ نابالغ کے پیچھے تراویح بھی جائز نہیں، اگر کوئی بالغ حافظ نہ ملے، تو **ألم تر كيف**...... وغیرہ سے مختلف سورتیں پڑھ کر تراویح پڑھ لی جائے۔" (۳)

اس سے معلوم ہوا کہ آج جو رواج پڑ گیا کہ نابالغ بچوں سے قرآن سننے کے شوق میں، ان کو امام بنا کر ان کی تراویح میں اقتدا کرتے ہیں، یہ غلط ہے؛ اگر بچوں کو

---

(۱) الهداية:۱/۳۶۹

(۲) قال: [ولايصح اقتداء رجل بامرأة وصبي مطلقاً]ولوفي جنازة ونفل على الأصح. (الدرالمختار مع الشامي:۲/۳۲۱)

(۳) امداد المفتین:۳۶۳

عادت ڈالنے یا ان کی ہمت افزائی کے لیے امام بنانا ہو، تو ان کے پیچھے نابالغ بچوں کو ہی پڑھائیں، اس سے ان کو عادت بھی پڑ جائے گی، ہمت بھی ہو جائے گی اور بڑے لوگ بھی ان کا قرآن سن سکیں گے۔

ٹیپ ریکارڈ (Tape recorder) کے ذریعے تراویح

بعض لوگوں کے متعلق سنا گیا ہے کہ وہ کسی اچھے قاری کی نمازِ تراویح کی آواز ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے کیسٹ (Cassette) میں بھر کر، پھر اسی آواز کی اقتدا میں نمازِ تراویح ادا کرتے ہیں؛ مگر معلوم ہونا چاہیے کہ یہ سراسر غلط اور فضول حرکت ہے اور اس سے نماز ادا نہیں ہوتی؛ کیوں کہ یہ ایک غیر جان دار آلہ ہے، جو اس بات کی صلاحیت نہیں رکھتا کہ اس کی اقتدا کی جائے؛ غور کیجیے کہ جب نابالغ حافظِ قرآن بچے کی اقتدا صحیح نہیں، تو غیر جان دار آلے کی اقتدا کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟!!

پھر علما نے لکھا ہے کہ جو شخص نماز میں نہ ہو، اس کے امتثال سے یعنی اس کے حکم پر نقل و حرکت سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ غیر جان دار آلہ، نماز سے خارج ہے، اس کے مطابق نقل و حرکت کرنا در اصل ایسی چیز کی اقتدا ہے، جو خارجِ نماز ہے اور اس سے اقتدا اگر بالفرض صحیح ہو بھی گئی، تو اس کے امتثال پر نماز فاسد ہو گی؛ اس لیے یہ محض جہالت ہے کہ ایک آلے کو رکھ کر اس کے پیچھے نماز ادا کی جائے۔

ٹی-وی (T.V) سے تراویح کی نماز

یہی حکم ٹی-وی کا بھی ہے کہ یہ ایک غیر جان دار آلہ ہے، اس کی اقتدا بھی درست نہیں ہو سکتی؛ لہٰذا اگر کسی جگہ کی نمازِ تراویح ٹی-وی کے پردے پر دکھائی جائے اور کوئی اس کو دیکھ کر اس کی اقتدا کرے، تو یہ درست نہیں ہے۔

اگر کوئی یوں کہے کہ ہم اقتدا تو مثلاً کعبۃ اللہ کے امام کی کر رہے ہیں، یہ محض واسطہ ہے، جیسے لوڈ اسپیکر (Loudspeaker) کا واسطہ ہوتا ہے؟ تو یہ بھی صحیح نہیں؛ کیوں کہ حسبِ تصریحِ فقہا، امام ومقتدی کا ایک ہی مکان میں ہونا اقتدا کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے، ورنہ اقتدا صحیح نہ ہوگی۔

"نور الإیضاح" میں ہے:

" وأن لا یفصل بین الإمام والمأموم صف من النساء، وأن لا یفصل نھر یمر فیه الزورق ولاطریق تمرفیه العجلة. (۱)

ترجمہ: اقتدا کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ امام اور مقتدی کے درمیان عورتوں کی صف فصل نہ کرے اور یہ کہ کوئی ایسی نہر بھی فصل نہ کرے، جس میں چھوٹی کشتی چل سکے یا ایسا راستہ بھی نہ ہو، جس میں گاڑی چل سکے۔

"الدر المختار" میں ہے:

قال: صلاۃ المؤتم بالإمام بشرط عشرة ......واتحاد مکانھما وصلاتھما." (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ امام ومقتدی کے درمیان اگر ایک گاڑی کا یا ایک نہر کا راستہ بھی حائل ہوگا، تو اقتدا صحیح نہ ہوگی، اب ٹی-وی دیکھنے والے اور ٹی-وی پر نشر ہونے والی نماز کے امام پر غور کرو کہ ان دونوں میں کتنے راستے، کتنی نہریں حائل ہیں، پھر یہ اقتدا کیسے صحیح ودرست ہوگی؟

---

(۱) نور الایضاح مع مراقي الفلاح :۱۰۸-۱۰۹

(۲) الدر المختار مع الشامي:۲/۲۸۴-۲۸۵

البتہ اگر امام و مقتدی کا مکان (جگہ) ایک ہو، درمیان میں ایسی کوئی چیز حائل نہ ہو اور امام کی اقتدا کی نیت سے نماز پڑھ لی جائے اور ٹی-وی کو محض واسطہ خیال کرے، تو نماز صحیح ہو جائے گی، جیسے سنا گیا کہ کعبۃ اللہ میں امام کی نقل و حرکت کے مشاہدہ کرنے کے لیے ایسا انتظام کیا گیا ہے، تو یہ درست ہے؛ مگر چوں کہ نماز میں نمازی کے سامنے دائیں بائیں، پیچھے یا اوپر تصاویر کا ہونا، مکروہ ہے؛ اس لیے اس سے اگر چہ نماز صحیح ہو جائے گی، مگر مکروہ ہوگی۔

"نور الإیضاح" میں ہے:

"وأن یکون فوق رأسه أو خلفه أو بین یدیه أو بحذائه صورة".[1]

ترجمہ: (مکروہ ہے) کہ نمازی کے سر کے اوپر یا اس کے پیچھے یا اس کے سامنے یا اس کے بازو کوئی تصویر ہو۔

اس لیے اس صورت سے بھی احتراز کرنا چاہیے؛ تا کہ نماز مکروہ و ناقص نہ ہو جائے۔

گھروں میں با جماعت تراویح پڑھنا

نمازِ تراویح کے بارے میں علما و ائمہ کا اختلاف ہے کہ وہ مسجد میں افضل ہے یا گھر میں؟ جمہور علما کا یہ مذہب ہے کہ نمازِ تراویح مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھنا افضل ہے۔[2]

---

(۱) نور الإیضاح مع المراقي:۱۳۲

(۲) قال: ولأن الاجتماع علیٰ واحد أنشط لکثیر من المصلین، وإلیٰ قول عمر جنح الجمهور. (فتح الباري:۵/۴۴۷)

اس لیے بہتر یہی ہے کہ تراویح کی نماز مسجد میں ادا کی جائے؛ لیکن اگر کوئی گھر میں پڑھ لے، تو کوئی گناہ نہیں؛ البتہ جمہور مذہب پر مسجد کی جماعت کی فضیلت اس کو حاصل نہ ہوگی۔(۱)

اور جن علما کے نزدیک گھر میں تراویح پڑھنا افضل ہے، ان کے مذہب پر یہی افضل ہوگا؛ مگر جمہور کے مذہب کے خلاف کرنا اچھا نہیں؛ البتہ اگر کسی مصلحتِ دینیہ کے پیشِ نظر گھر میں جماعت بنا کر تراویح پڑھی جائے، تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے؛ مثلاً بچوں اور بیوی و دیگر گھر کی عورتوں کو تراویح کی عادت ڈالنے یا ان کی سہولت کی خاطر ایسا کر لے، تو مضائقہ نہیں؛ کیوں کہ بہت سے حضراتِ سلفِ صالحین سے منقول ہے کہ وہ گھر پر ہی تراویح پڑھتے تھے، مثلاً حضرت عروہ، حضرت قاسم، حضرت سالم، حضرت نافع وغیرہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں امام طحاوی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ وہ مسجد سے (فرض عشا) کے بعد لوٹ جاتے تھے اور لوگوں کے ساتھ مسجد میں نماز تراویح نہیں پڑھتے تھے۔(۲)

اس لیے اگر دینی مصلحت کی پیشِ نظر گھر میں جماعت بنالی جائے، تو کوئی حرج نہیں ہے؛ لیکن سستی کی وجہ سے ایسا نہ کرنا چاہیے، تا کہ جمہور کی مخالفت لازم نہ آئے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تراویح گھر میں پڑھنا ہو، تو بھی عشا کی نماز جماعت سے مسجد میں پڑھنا چاہیے۔

---

(۱) قال: أما لو تخلف عنها رجل من أفراد الناس وصلى في بيته فقد ترك الفضيلة، و إن صلى أحد في البيت بالجماعة لم ينالوا فضل الجماعة.

(ردالمحتار:۲/۴۹۵)

(۲) شرح معاني الآثار: ۱/۳۵۰-۳۵۱

تراویح کے لیے عورتوں کا مسجد میں آنا

آج کل بہت سی مساجد میں عورتوں کے لیے تراویح کا انتظام کیا جاتا ہے؛ مگر یہ رواج علمائے حنفیہ کی تصریحات کے خلاف، نیز احادیث سے ثابت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے لیے مسجد کے بہ جائے ان کے گھر کو افضل قرار دیا ہے۔

چناں چہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کی نماز گھر کے اندر (دالان) میں افضل ہے، اس کی نماز سے جو صحن میں ہو اور اس کی نماز اندر کی کوٹھری میں بہتر ہے، اس کی نماز سے، جو دالان میں ہو۔ (۱)

نیز حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ قسم کھا کر فرماتے تھے کہ عورت کے لیے اپنے گھر سے بہتر نماز کی کوئی جگہ نہیں؛ مگر حج وعمرے میں (کہ وہاں مسجد میں پڑھنا بہتر ہے) سوائے اس عورت کے، جو شوہر سے مایوس ہوگئی ہو (یعنی بوڑھی ہو، تو وہ مسجد میں پڑھ سکتی ہے)۔ (۲)

---

(۱) عن عبداللّٰہ عن النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال: صلاۃ المرأۃ في بیتها أفضل من صلاتها في حجرتها وصلا تها في مخدعها أفضل من صلا تها في بیتها.
(أبو داود: ۸۵الرقم،۵۷۰، السنن الکبری للبیهقي:۳/۱۸۸،الرقم،۵۳۶۱، المستدرک للحاکم:۱/۳۱۵، الرقم:۷۶۰)

(۲) عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ أنهٗ کان یحلف ، فیبلغ الیمین ، ما من مصلی للمرأۃ خیر من بیتها إلا في حج أو عمرۃ إلا امرأۃ قد یئست من البعولة وهي في منقلیها، قلت : ما منقلیها؟ قال: امرأۃ عجوز قد تقارب خطوها.
(مجمع الزوائد: ۲/۱۵۶،الرقم،۲۱۱۴، السنن الکبریٰ للبیهقي : ۳/۱۸۸،الرقم، ۵۳۶۴،مصنف عبدالرزاق:۳/۱۵۰،الرقم،۵۱۱۷)

یہ اس دَور کی بات ہے، جب کہ عورتوں میں شرم وحیا پردے وحجاب کا کامل اہتمام تھا؛ پھر اس کے بعد شرم وحیا کی کمی اور پردے میں کوتاہی ہونے لگی، تو صحابۂ کرام نے عورتوں کو مسجد میں آنے سے روک دیا اور منع فرمادیا۔

چناں چہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے (جو مزاج شناسِ رسول تھیں) فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان باتوں کو دیکھتے، جو عورتوں نے (بے پردگی وغیرہ کی) پیدا کرلی ہیں، تو مسجد میں آنے سے ان کو ضرور منع فرمادیتے، جیسے بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کردیا گیا تھا۔(۱)

جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنے دَور کے حالات کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا ہے، تو غور کریں کہ موجودہ حالات میں ان کا کیا فتویٰ ہوتا؟ اس بنا پر فقہائے حنفیہ نے مطلقاً عورتوں کو منع کردیا کہ وہ مسجد میں نہ آئیں، جیسا کہ فقہ کی معتبر کتابوں میں موجود ہے؛ البتہ بہت ہی بوڑھی عورت کو اجازت دی ہے۔(۲)

---

(۱) عن عمرة بنت عبد الرحمن رضي الله عنها أنها سمعت عائشة زوج النبي صلى الله عليه وسلم تقول: لو أن رسول الله صلى الله عليه وسلم رأى ما أحدث النساء لمنعهن المسجد كما منعت نساء بني إسرائيل ، قال: قلت لعمرة : أنساء بني إسرائيل منعن المسجد؟ قالت: نعم!

(المسلم:۱۸۸، الرقم:۴۴۵، أبو داود:۸۵، الرقم،۵۶۹، مصنف عبد الرزاق: ۳/ ۱۴۹، الرقم:۵۱۱۲)

(۲) قال: ويكره لهن حضور الجماعات ، يعني الشواب منهن لما فيه من خوف الفتنة ، ولابأس للعجوز أن تخرج في الفجر و المغرب والعشاء ، وهٰذا عند أبي حنيفة ، وقالا: يخرجن في الصلوات كلها. (الهداية:۱/ ۳۷۴)

قال: [ويكره حضورهن الجماعة مطلقًا] ولو عجوزا ليلاً [على المذهب] المفتى به .(الدر المختار مع الشامي:۲/ ۳۰۷)..........

لہٰذا تراویح کے لیے عورتوں کو مسجد میں نہ آنا چاہیے، اس سے پرہیز کرنا ہی احتیاط کا مقتضی ہے، اس مسئلے پر تفصیل، احقر نے اپنے ایک رسالے میں پیش کی ہے جس کا نام ہے ''عورت کی نماز، حدیث وفقہ کی روشنی میں''۔
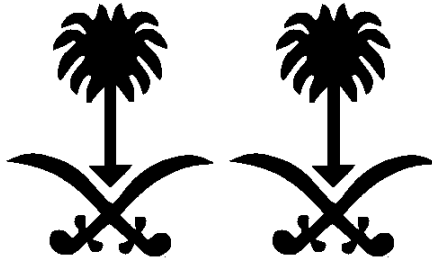
....وقال ولا يحضرن الجماعات؛ لأنه لا يومن الفتنة من خروجهن ، أطلقه فشمل الشابة والعجوز والصلاة النهارية والليلية . قال المصنف في الكافي: والفتوىٰ اليوم على الكراهة في الصلاة كلها لظهور الفساد.
(البحر الرائق:۱/ ۶۲۷-۶۲۸)

صدقۂ فطروفدیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

صدقۂ فطر وفدیہ

صدقۂ فطر کی مقدار، گرام (Gram) کے حساب سے

صدقۂ فطر کی مقدار کے سلسلے میں اصل یہ ہے کہ ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو دیے جائیں، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بخاری میں مروی ہے۔ (۱)

پھر حضرات صحابہ وعلما نے دوسرے اناجوں میں سے ایک صاع کھجور یا ایک صاع جَو کی قیمت کے برابر دینے کو جائز قرار دیا ہے؛ چناں چہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے ایک صاع جو یا کھجور سے موازنہ فرما کر ارشاد فرمایا کہ ''میرے خیال میں گیہوں کا ایک مُد دو مُد کے برابر ہے۔'' (۲)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ نصف صاع گیہوں، ایک صاع جو یا کھجور کے برابر ہے؛ کیوں کہ ایک صاع چار مُد کا ہوتا ہے۔

---

(۱) عن ابن عمر رضی اللہ عنہ: أن رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فرض زکاۃ الفطر، صاعاً من تمر أوصاعاً من شعیر علیٰ کل حر أو عبد، ذکر أو أنثیٰ من المسلمین. (البخاري :۲۹۳، الرقم:۱۵۰۴، المسلم:۹-۳۷، الرقم:۹۸۴)

(۲) عن أبي سعید الخدري رضی اللہ عنہ قال: کنا نعطیها في زمان النبي صلی اللہ علیہ وسلم صاعاً من طعام ، أو صاعاً من تمر، أوصاعاً من شعیر، أو صاعاً من زبیب، فلما جاء معاویة رضی اللہ عنہ ، وجاء ت السمراء ، قال :أری مُداً من هذا یعدل مدّین . (البخاري:۲۹۴، الرقم:۱۵۰۸، المسلم:۳۸۰، الرقم:۹۸۵)

جیسا کہ شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے۔(۱)

جب آپ رضی اللہ عنہ کے خیال میں ایک مد گیہوں دو مد کھجور کے برابر ہیں، تو دو مد گیہوں چار مد کھجور یا جو کے برابر ہوئے اور دو مد کا آدھا صاع اور چار مد کا ایک صاع ہوتا ہے؛ لہٰذا اکثر علما نے اسی کے مطابق صدقۂ فطر کی مقدار میں یہ لکھا ہے کہ

کھجور یا جو دینا ہو، تو ایک صاع اور گیہوں دینا ہو، تو آدھا صاع دینا ہوگا۔(۲)

پھر جب علما نے دیکھا کہ مد، صاع، رطل وغیرہ شرعی وفقہی اوزان و پیمانے رواج پذیر نہ رہے اور ان کی جگہ تولہ، ماشہ، سیر و چھٹانک وغیرہ جدید پیمانوں و اوزان نے لے لی ہے، تو انھوں نے نہایت تحقیق و کاوش سے قدیم پیمانوں اور اوزان کو ان جدید اوزان و پیمانوں (جو ہمارے لحاظ سے قدیم ہو چکے ہیں) میں تبدیل کیا اور لوگوں کے لیے سہولت و آسانیاں پیدا فرمادیں؛ چناں چہ اس مسئلے پر سب سے زیادہ محقق و مفصل رسالہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ''اوزانِ شرعیہ'' کے نام سے لکھا ہے، جو آپ کے مجموعہ رسائل ''جواہر الفقہ'' میں شامل ہے اور اس کی بڑے بڑے اکابر علما نے تقریظ کی اور تعریف فرمائی ہے؛ اس رسالے میں حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے بڑی لمبی بحث فرمائی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ

---

(۱) قال: [نصف صاع] فاعل يجب [من بر أو دقيقه أو سويقه أو زبيب] بأن يعطي نصف صاع دقيق بر أو صاع شعير يساويان نصف صاع بر وصاع شعير. (الدر المختار مع الشامي: ۳/ ۳۱۸-۳۱۹)

(۲) (الهداية :۲/ ۲۳۵،نور الإيضاح مع المراقي:۲۶۳،بدائع الصنائع:۲/ ۵۴۰، مجمع الأنهر:۱/ ۳۳۷،فتاویٰ عالمگیری:۱/ ۲۱۰،الشامي:۳/ ۳۱۸، البحر الرائق:۲/ ۴۴۱، القدوري:۶۱، الاختيار لتعليل المختار:۱/ ۱۲۳)

صاع کی مقدار، مثقال کے حساب سے تین سیر چھ چھٹانک ہے اور آدھے صاع کی مقدار ڈیڑھ سیر تین چھٹانک ہے اور درہم کے حساب سے صاع کی مقدار تین سیر چھ چھٹانک تین تولہ اور نصف صاع کی مقدار ڈیڑھ سیر تین چھٹانک ڈیڑھ تولہ ہے اور بہ حسابِ مُد صاع کی مقدار ساڑھے تین سیر، چھ ماشہ اور نصف صاع کی مقدار پونے دو سیر تین ماشہ ہوتی ہے،ان تینوں مقداروں میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے؛ مگر چوں کہ آخری مقدار میں آدھا سیر زیادہ بتایا گیا ہے؛ اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ صدقۂ فطر میں اسی کے لحاظ سے نکالا جائے؛ یعنی گیہوں دینا ہو،تو پونے دو سیر تین ماشے کے حساب سے دینا چاہیے،اسی میں احتیاط ہے اور جَو وغیرہ دینا ہو،تو اس کا دوگنا یعنی ساڑھے تین سیر، چھ ماشہ دینا چاہیے۔(۱)

مگر اب مشکل یہ ہے کہ تولہ، ماشہ، سیر اور چھٹانک کا زمانہ بھی ختم ہوگیا اور اب ہم اس قابل ہی نہ رہے کہ ان چیزوں سے حساب کرسکیں؛ بل کہ یہ الفاظ عام طور پر غیر مانوس اور اس سے حساب و کتاب تقریباً مفقود ہو گیا ہے اور اس کی جگہ گراموں(Gram) کا حساب رائج ہو گیا ہے اور بہ قول میرے استاذ ’’حضرت مولانا مفتی مہربان علی صاحب رحمہ اللہ ‘‘:

’’آج کل چوں کہ میٹرک اوزان اور پیمانوں کا عام رواج ہو گیا ہے؛ اس لیے کسی وزن کو تولے، ماشے سے سمجھنا بھی اب اتنا آسان نہ رہا؛ جتنا کہ کلوگرام اور ملی گرام اور کلومیٹر وغیرہ سے سمجھنا اور سمجھانا سہل ہوگیا۔‘‘(۲)

---

(۱) جواہر الفقہ :۱/ ۴۲۷

(۲) امداد الاوزان:۱/ ۲

اس لیے اب علما کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان شرعی اوزان کو کلوگرام، ملی گرام وغیرہ میں منتقل کیا جائے۔

یہ بات معلوم و مسلم ہے کہ ایک سیر ’’ ۹۳۳/گرام، ۱۲۰/ملی گرام‘‘ کے برابر ہوتا ہے اور ایک ماشہ ’’ ۹۷۲/ملی گرام‘‘ کا ہوتا ہے، اس حساب سے پونے دوسیر، تین ماشہ کو گراموں میں تبدیل کرنے سے گیہوں کے حساب سے ایک صدقہ فطر کی صحیح مقدار ’’ایک کلو ۶۳۵/گرام، ۸۷۲/ملی گرام ہوتی ہے اور مزید احتیاط کے لیے بہتر ہے کہ ’’ایک کلو ۷۵۰/گرام‘‘ دے دیا جائے؛ یعنی پونے دو کلو گیہوں یا اس کی قیمت دے دی جائے۔ میرے استاذ مولانا مہربان علی بڑوتوی رحمۃ اللہ نے بھی ’’امداد الاوزان‘‘ میں یہی تحقیق فرمائی ہے۔

اگر کوئی اس سے زیادہ دے دے، تو جائز ہے؛ البتہ واجب وہی مقدار ہے، جس کا ابھی ذکر کیا گیا؛ یہ مقدار گیہوں کی بیان کی گئی ہے اور اگر جو یا کھجور دینا ہو، تو اس کا دوگنا (Double) دینا چاہیے، یعنی ’’ساڑھے تین کلو‘‘ اور اِن مذکورہ چیزوں کے علاوہ کوئی اور چیز مثلاً: چاول دینا ہو، تو یا تو پونے دو کلو گیہوں یا ساڑھے تین کلو جو کی قیمت کے برابر چاول وغیرہ دینا چاہیے۔

اس لیے اگر پونے دو کلو گیہوں یا ان کی قیمت دی جائے، تو بہتر اور احتیاط ہے، ورنہ ایک کلو ۶۳۶ گرام گیہوں یا ان کی قیمت دے دیں، صدقۂ فطر ادا ہو جائے گا اور یہ مقدار گیہوں کی ہے، اگر جو یا کھجور دینا ہو، تو اس کا دُگنا دینا ہوگا؛ یعنی احتیاط پر عمل کرنے میں ساڑھے تین کلو، ورنہ تین کلو ۲۷۲ گرام یا اس کے برابر قیمت۔

روزے کے فدیے کی مقدار

جن صورتوں میں روزے کے بہ جائے فدیہ دے دینا جائز ہے، ان میں علما

نے تصریح کی ہے کہ ایک روزے کا فدیہ ایک فطرے کے برابر ہے۔(۱)

لہٰذا موجودہ حساب کی رو سے اگر کوئی روزے کا فدیہ دینا چاہے، تو صدقۂ فطر کی جو مقدار اوپر لکھی گئی ہے، وہی دینا ہوگا؛ یعنی ایک روزے کے بدلے پونے دو کلو گیہوں یا اس کی قیمت یا ساڑھے تین کلو جو یا کھجور یا اس کی قیمت دینا ہوگا اور یہ احتیاطاً ہے، ورنہ ایک کلو ۶۳۶ گرام گیہوں یا اس کی قیمت یا تین کلو ۲۷۲ گرام جو یا کھجور یا اتنی قیمت دے دینا کافی ہوگا۔

صدقۂ فطر سیدوں کو دینا

صدقۂ فطر صرف ان لوگوں کو دینا جائز ہے، جن کو زکات دی جاسکتی ہے اور جن کو زکات دینا جائز نہیں، ان کو صدقۂ فطر دینا بھی جائز نہیں اور یہ معلوم ہے کہ سید، (ہاشمی) کو زکات دینا جائز نہیں؛ اس لیے صدقۂ فطر بھی ان کو نہیں دیا سکتا، جیسا کہ علامہ شامی نے اس کی تصریح کی ہے۔(۲)

اگر موجودہ دَور میں جب کہ محتاج سیدوں کو اس کے سوا چارہ نہیں رہا کہ وہ زکات وصدقات وصول کر کے اپنا گزارہ کریں، کیا اس حکم میں کسی ترمیم کی گنجائش ہے؟

اس سلسلے میں حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ جائز ہے، علامہ شامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

---

(۱) قال: الفدية لكل يوم نصف صاع من بر. (نور الإيضاح مع مراقي: ۲۵۲)
قال: والشيخ الفاني الذي لا يقدرعلى الصيام يفطر و يطعم لكل يوم مسكيناً؛ نصف صاع من بر أو صاعاً من تمر أو شعير. (الهداية :۲/۲۷۰)

(۲) قال: [مصرف الزكاة والعشر]وهو أيضا مصرف لصدقة الفطر،فقال: [لاتصرف......إلىٰ بني هاشم](الدر المختار مع الشامي :۳/۲۸۳،۲۹۹)

"و روی أبو عصمة عن الإمام رحمه الله أنهٗ يجوز الدفع إلىٰ بني هاشم في زمانه ؛ لأن عوضها وهو خمس الخمس لم يصل إليهم لإهمال الناس أمر الغنائم و إيصالها إلىٰ مستحقيها، وإذا لم يصل إليهم العوض عادوا إلى المعوض، كذا في البحر"(۱)

ترجمہ: ابو عصمہ نے بیان کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اپنے زمانے میں ہاشمی کو (زکات) دینا جائز قرار دیا ہے؛ کیوں کہ زکات کا عوض؛ یعنی غنیمت کا خمس الخمس ان لوگوں تک نہیں پہنچا؛ کیوں کہ لوگ اموالِ غنیمت میں اور اس کو مستحقین تک پہنچانے میں ڈھیل برت رہے ہیں، جب ان کو عوض نہ پہنچا، تو معوض یعنی زکات ملنا چاہیے۔

حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب رحمہ اللہ بانی "باقیات الصالحات، ویلور" نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔(۲)

اور حضرت امام طحاوی رحمہ اللہ نے امام صاحب رحمہ اللہ کے قول کو نقل فرما کر کہا ہے کہ ہم اسی کو اختیار کرتے ہیں۔(۳)

مگر ہمارے علمانے تصریح کی ہے کہ یہ قول معمول بہ نہیں ہے، مفتیٰ بہ و معمول بہ یہی ہے کہ سید کو زکات وصدقاتِ واجبہ دینا جائز نہیں، یہی ظاہر الروایۃ ہے۔(۴)

---

(۱) الدر المختار مع الشامي: ۳/۲۹۹

(۲) فتاویٰ باقیات الصالحات: ۹۴

(۳) شرح معاني الآثار: ۲/۱۱

(۴) إعلاء السنن: ۹/۸۱، البحر الرائق: ۲/۲۴۷

وجہ اس کی یہ ہے کہ سیدوں کو اس سے احتراز کا حکم اس لیے ہے کہ زکات و صدقاتِ واجبہ لوگوں کا میل کچیل ہے، اللہ تعالیٰ انہیں اس سے بچائے رکھنا چاہتا ہے، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا:

اے بنی ہاشم! اپنے آپ کو روکے رکھو؛ کیوں کہ صدقات، لوگوں کا غسالہ و میل کچیل ہے۔(۱)

اور یہ وجہِ حرمت ہر زمانے میں موجود ہے؛ اس لیے سیدوں کو زکات وفطرہ نہ دینا چاہیے اور ان کو لینا بھی نہیں چاہیے اور خمس الخمس کو جو زکات وصدقات کا عوض بتایا گیا ہے، جیسے امام ابو حنیفہ رَحِمَہُ اللہ سے اوپر منقول ہوا، اس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اب موجودہ حالات میں ان کو زکات دینا درست ہے؛ کیوں کہ اس سے صرف یہ ثابت ہوا کہ زکات وصدقات سے ان کو محروم کر کے، ان کے لیے دوسرا راستہ کھولا گیا تھا، اب یہ راستہ بند ہو گیا ہے، تو اس کا دوسرا طریقہ ڈھونڈھنا چاہیے، یہ نہیں کہ جس چیز سے ان کو بچا کر رکھنے ہی کے لیے ان کو خمس الخمس دیا جاتا تھا، اسی راستے کو کھول دینے اور اسی میں ان کو ملوث کرنے کی کوشش کی جائے۔

الغرض! زکات کی طرح فطرہ بھی سیدوں کو نہیں دینا چاہیے اور نہ ان کو لینا چاہیے، اگر قرابتِ رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کا احساس ہے، تو دینے والوں کو چاہیے کہ دوسرے اچھے مال سے ان کی خدمت کر کے ماجور ہوں۔(۲)

---

(۱) كنز العمال عن الطبراني كذافي إعلاء السنن:۹/۷

(۲) اسی مسئلے کے تعلق سے حضرت والا نے حسبِ روایت نہایت محقق و مدلل اور بہت متوازن و معتدل تحریر حال ہی میں سپردِ قرطاس فرمائی ہے، تحقیق پسند احباب کی خدمت میں یہ مکمل تحریر درج ذیل کی جاتی ہے:...

....

سوال:

موجودہ دَور میں لوگ عام طور پر غیرِ زکات سے خرچ کرنے کے عادی نہیں ہیں، زیادہ سے زیادہ صرف زکات نکالتے ہیں، ان حالات میں سوائے زکات کے کسی اور مَد سے ''سیدوں'' کو دینے والا کوئی نہیں، اگر یہ کہہ دیا جائے کہ سیدوں کو زکات جائز نہیں، تو غریب سیدوں کے گزارے کا مسئلہ بہت پریشان کن ہوگا، کیا ان حالات میں سیدوں کو زکات دینے کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے؟ اور کیا یہ مسئلہ متفقہ ہے؟ اس میں احناف و دیگر ائمہ کیا کہتے ہیں؟ کیا امام ابوحنیفہ کی ایک روایت بھی ان کو دینے کے جواز کی موجود ہے؟ (المستفتي: مولانا طارق)

الجواب:

سیدوں یعنی نبی ہاشم کو زکات دینے کی حرمت منصوص ہے؛ کیوں کہ احادیث میں صراحت کے ساتھ اس سے منع کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں اللہ کے رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ

'' إن هٰذه الصدقة إنما هي أوساخ الناس ، ولا تحل لمحمد ولا لآل محمد ''.

تَرجَمَۃ: یہ صدقہ تو بس لوگوں کا میل ہے اور محمد و آلِ محمد کے لیے حلال نہیں۔

(الصحیح للمسلم : ۲۵۳۱، الصحیح لابن خزیمة: ۴/۵۵، أبو داود: ۲۹۸۷، النسائي: ۲۶۰۹)

لہٰذا منصوص کے مقابلے میں کوئی اجتہاد ورائے معتبر نہیں ہوتی؛ پھر اس پر امت کا اجماع بھی ہو چکا ہے، علامہ ابن قدامہ الحنبلی رَحِمَہُ اللّٰہُ لکھتے ہیں کہ

'' لانعلم خلافاً فيأن بني هاشم لا تحل لهم الصدقة المفروضة ''

تَرجَمَۃ: بنی ہاشم کو زکات دینا ناجائز ہونے کے مسئلے میں کسی اختلاف کا علم نہیں۔ **(المغنی لابن قدامة : ۵/۲۲۴)**

....

اورعلامہ نووی،شافعی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ

" فالزكاة حرام على بني هاشم و بني المطلب بلا خلاف ، إلاماسبق فيما إذا كان أحدهم عاملاً و الصحيح تحريمهٔ".

(المجموع شرح المهذب:۵/۲۲۷)

ان کے علاوہ علامہ عبدالرحمٰن ابن قدامہ رحمہ اللہ نے الشرح الكبير (۲/۷۱۰) میں اور البهوتي نے کشف القناع (۵/۴۱۱) میں سیدوں پر زکات کی حرمت پر اجماع نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس مسئلے میں تمام ائمہ کا اتفاق ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ سیدوں کے گذرِ معاش کا مسئلہ کیسے حل ہو؟ تو یہ مسئلہ آج کا نہیں؛ بل کہ پہلے ادوار میں بھی زیرِ بحث آچکا ہے اور خود امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی روایت اس کا پتہ دیتی ہیکہ اُس دَور میں بھی سیدوں کے سلسلے میں یہ مسئلہ زیرِغور آیا ہے، امام صاحب کی ایک روایت تو اس بارے میں یہی ہے کہ اب سیدوں کو زکات دینا جائز ہے اور اس کی وجہ انھوں نے یہ بیان کی ہے کہ پہلے سیدوں کو مالِ غنیمت میں سے "خمس" یعنی پانچواں حصہ دیا جاتا تھا اور یہ بہ طورِ حقِ قرابتِ رسول ان کو ملتا تھا؛ مگر جب لوگوں نے مالِ غنیمت کے سلسلے میں کوتاہی کی اور سیدوں کو ان کا حصہ دینے سے پہلوتہی کی، تو ان کو زکات کی مَد سے دینا جائز ہے۔

(البحر الرائق :۲/۲۶۶،الشامي:۲/۳۵۰)

لیکن امام صاحب رحمہ اللہ کا مذہب، جس پر اصحابِ متون نے اتفاق کیا ہے اور اس کو اپنے متون میں درج کرنے کا اہتمام کیا ہے، وہ یہی ہے کہ سیدوں کو کسی حال میں زکات دینا، جائز نہیں اور امام صاحب رحمہ اللہ کی اس دوسری روایت کو فقہا نے ضعیف قرار دے کر رد کیا ہے اور اکثر اصحابِ متون نے اس کا ذکر تک نہیں کیا ہے اور بعض نے صاف طرح سے اس روایت کے رد کی جانب اشارہ کیا ہے۔ اور مذہب اسی کو قرار دیا ہے کہ سیدوں کو کسی حال میں بھی زکات دینا جائز نہیں۔

ہاں! شوافع میں سے "علامہ ابوسعید اصطخری" کہتے ہیں کہ

زکات سے سیدوں کو اس لیے محروم کیا گیا تھا کہ ان کو مالِ غنیمت کا خمس دیا جاتا تھا، جب ان کو اس میں سے نہیں ملتا ہے، تو ان کو زکات دینا واجب ہے۔ مگر خود حضراتِ شوافع نے اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ مذہبِ شوافع تو یہی ہے کہ سیدوں کے لیے زکات جائز نہیں، کیوں کہ زکات کا ان کے حق میں حرام ہونا رسول اللہ ﷺ کی شرافت کی وجہ سے ہے اور یہ علت ان کو خمس نہ دیے جانے سے زائل نہیں ہو جاتی۔

(التنبيه لأبي إسحاق الشيرازي : ۵۲/۱، المهذب: ۱۷۴/۱، المجموع لشرح المهذب: ۲۲۷/۶، حلية العلماء للقفال: ۵۴/۳)

البتہ اکثر مالکیہ نے یہ لکھا ہے کہ اگر سیدوں کو ان کا بیت المال سے حصہ نہ پہنچے اور اس کی وجہ سے فقر و فاقہ ان کو مجبور کر دے، تو ان کو زکات دینا جائز ہے۔ علامہ خرشی نے "مختصر خلیل" کی شرح میں اور علامہ دسوقی نے "**الشرح الكبير**" کے حاشیے میں، علامہ صاوی نے "**بلغة السالک**" میں لکھا ہے کہ

> **" محل عدم إعطاء بني هاشم إذا أعطوا ما يستحقونه من بيت المال فإن لم يعطوه و أضربهم الفقر أعطوا منها ، و إعطاؤهم حينئذ أفضل من إعطاء غيرهم ".**

(شرح الخليل للخرشي: ۳۳۹/۶، الدسوقي على الشرح الكبير : ۴۷۰/۴، بلغة السالک: ۴۲۷/۱)

لیکن اسی کے ساتھ علامہ باجی مالکی رحمہ اللہ نے یہ قید بھی لگائی کہ یہ جواز اس وقت ہے کہ اضطرار یہاں تک پہنچا دے کہ مردار کا کھانا اس کو جائز ہو جائے، تو اس کے لیے زکات جائز ہے، اس شرط کو بعض فقہائے مالکیہ نے قبول کیا اور فرمایا کہ یہی ظاہر و متعین ہے اور بعض نے اس سے اختلاف کیا ہے، جیسا کہ اوپر کے حوالوں سے معلوم ہو سکتا ہے۔

....

اس کا مطلب یہ ہوا کہ بہت سے مالکیہ کے یہاں بھی جواز ایک شرط سے مشروط ہے کہ حالت اضطرار ہو ۔ ورنہ سیدوں کو زکات دینا ان کے یہاں بھی جائز نہیں ہے ؛ ہاں بعض نے صرف حاجت کی وجہ سے بھی جائز قرار دیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ حنفیہ، شافعیہ وحنابلہ تو مطلقاً عدمِ جواز کے قائل ہیں اور یہاں کا اصل مذہب ہے اور جو امام ابو حنیفہ اور علامہ اصطخری سے دوسری روایت جواز کی مروی ہے، اس کو حنفیہ وشافعیہ نے رد کر دیا ہے اور مالکیہ کے اکثر فقہا نے اگر چہ موجود حالات میں خمس نہ ملنے کی وجہ سے ان کو زکات دینے کا جواز اختیار کیا ہے؛ مگر اس شرط سے کہ اضطرار پیدا ہو جائے اور اس کی وجہ سے مردار کھانا اس کو حلال ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ اس شرط کے ساتھ سبھی علما کے نزدیک سیدوں کو زکات دینا جائز ہوگا؛ کیوں کہ جب مردار کھانا ہی حلال ہو جائے، تو زکات کھانے میں کیا حرج ہوسکتا ہے، تو یہ ایک انتہائی مجبوری کی صورت کا حکم ہے۔

الغرض! اس روایت کی بنیاد پر فقہا نے جواز کو اختیار نہیں کیا؛ بل کہ ضرورت ہونے کے باوجود اس کو رد کیا ہے اور اس کی وجہ یہی ہے کہ زکات کا ان کے حق میں منع ہونا، دراصل قرابتِ رسول وشرافتِ رسول کی وجہ سے ہے اور یہ بات ہر حال میں موجود ہے؛ لہٰذا جب علتِ منع موجود ہے، تو حکم بھی موجود وباقی ہے۔

اب رہا یہ کہ لوگ سیدوں کو دوسرے مدات سے نہیں دیتے، تو اس کے لیے ترغیب وتشویق دلانے کا اہتمام کرنا چاہیے اور بار بار توجہ دلانا چاہیے، آخر سوچنے کی ضرورت ہے کہ یہی امت تو آج مدارسِ اسلامیہ اور مساجد کے لیے کروڑہا روپیہ خرچ کر رہی ہے اور ان کی تعمیرات پر خوب لگا رہی ہے اور یہ غیرِ زکات سے ہی خرچ کیا جا رہا ہے، تو کیا اگر لوگوں کو ترغیب دی جائے، تو لوگ ان پر خرچ نہیں کریں گے؟ لہٰذا بندے کے نزدیک ان حالات میں بھی سیدوں کو زکات کا جواز صحیح نہیں ہے۔

صدقۂ فطر میں نوٹ دینا

یہ بات مسلم ومعلوم ہے کہ نوٹ خود مال نہیں ہے؛ بل کہ یہ دراصل اس مال کی سند اور چیک ہے، جو بہ ذمہ گورنمنٹ ہے؛ اسی لیے اگر جلی کٹی نوٹ بتائی جائے، تو بھی پورا مال مل جاتا ہے؛ الغرض نوٹ مال نہیں؛ بل کہ مال کی سند ہے اور صدقۂ فطر اور دوسرے صدقاتِ واجبہ میں یہ ضروری ہے کہ مستحق ومحتاج کو صدقے کے مال کا مالک بنادیا جائے، اگر اس کو مال کا مالک نہ بنایا گیا، تو زکات وفطرہ وغیرہ ادا نہ ہوں گے۔

اس حکم کے پیشِ نظر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج کل نوٹوں کا رواج بہت ہوگیا ہے اور بسا اوقات مہینوں تک روپیہ دیکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی؛ بل کہ سارا کام وکاروبار نوٹ پر ہی چلتا رہتا ہے اور جیسا کہ اوپر معلوم ہوا، نوٹ خود مال نہیں؛ لہٰذا اگر نوٹ کے ذریعے صدقۂ فطر دیا جائے، تو ظاہر ہے کہ مال نہیں؛ بل کہ مال کی سند اس کو دی گئی ہے، تو کیا اس صدقۂ فطر دینے والے کا صدقہ ادا نہ ہوگا؟

اس سلسلے میں علما کا اختلاف ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ وغیرہ نے زکات اور دیگر صدقاتِ واجبہ کے نوٹ سے ادا کرنے پر یہ بیان کیا ہے کہ زکات وصدقہ ادا نہ ہوگا؛ تا وقتے کہ وہ صدقہ لینے والا شخص اس نوٹ کو نقد (CASH) نہ کرالے، جب وہ نقد کرالے گا، تو ادا ہوجائے گی؛ ورنہ اگر خدانہ خواستہ نوٹ نقد کرانے سے پہلے گم ہوجائے، تو زکات وصدقہ ادا ہی نہ ہوگا۔ (۱)

---

(۱) چناں چہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے استفتا کیا گیا کہ زکات میں نوٹ دینے سے زکات ادا ہوجاتی ہے یا نہیں؟

تو آپ نے فتویٰ دیا کہ...

مگر دوسرے علما نے موجودہ حالات کے پیشِ نظر اس کو بھی جائز قرار دیا ہے کہ نوٹ کے ذریعے صدقہ ادا کیا جائے اور یہ کہ اس سے زکات ادا ہو جائے گی؛ کیوں کہ نوٹ کا رواج اس قدر ہو گیا ہے کہ اب عرف میں نوٹ ہی کو مال وثمن خیال کیا جاتا ہے؛ لہٰذا عرف کی بنا پر نوٹ کو مال کا حکم ہوگا؛ جب کہ یہ مال ہے، تو اس کو دینے سے زکات وفطرہ ادا ہو جائے گا؛ حضرت علامہ عبدالحی لکھنوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنے زمانے ہی میں نوٹ کو مال وثمن کے قائم مقام قرار دیا ہے؛ چناں چہ فرماتے ہیں کہ

> نوٹ ہر چند کہ خلقۃً ثمن (مال) نہیں عرفاً حکمِ ثمن میں ہے؛ بل کہ عینِ ثمن سمجھا جاتا ہے۔(۱)

لہٰذا موجودہ دَور میں اسی کو افتا کے لیے اختیار کرنے میں سہولت ہے۔(۲)

.... چوں کہ وہ مال نہیں، محض سندِ مال ہے، اس لیے نوٹ دینے سے زکات ادا نہیں ہوتی - اور آگے لکھتے ہیں کہ مسکین کو نوٹ دیا اور اس مسکین نے اس کو نقد یا کسی جنس کے بدلے فروخت کر کے اس نقد یا جنس پر قبضہ کر لیا، اب قبضے کے وقت زکات وغیرہ ادا ہو گئی اور اگر یہ دونوں صورتیں نہ ہوئیں، مثلاً اس مسکین کے پاس سے وہ نوٹ ضائع ہو گیا یا اس نے اپنے قرض میں کسی کو دے دیا، ان صورتوں میں زکات ادا نہیں ہوئی۔ (امداد الفتاویٰ:۲/ ۵-۶)

اسی طرح حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ فرماتے ہیں کہ:

اگر نوٹ زکات میں دیا گیا، تو جس وقت وہ شخص اس کو روپیے سے بدل لے گا، اس وقت زکات ادا ہو جائے گی۔ (فتاویٰ دار العلوم دیو بند:۶/ ۸۳)

حضرت مفتی ظفر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا بھی یہی قول ہے۔ (امداد الاحکام:۳/ ۱۳)

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ کا بھی یہی قول ہے۔ (کفایت المفتی:۴/ ۲۷۸)

(۱) **مجموعة الفتاویٰ : ۲/ ۲۲۷**

(۲) اسی رائے کو حضرت مفتی ظفیر الدین صاحب رَحِمَہُ اللّٰہُ مرتب فتاویٰ دار العلوم، دیو بند اور صاحبِ ''احسن الفتاویٰ'' نے بھی اختیار کیا ہے۔

(فتاویٰ دار العلوم دیو بند، حاشیہ:۶/ ۸۳، احسن الفتاویٰ:۴/ ۲۶۶)

صدقۂ فطر میں کنٹرول ریٹ(Control Rate) کا اعتبار نہیں

شہروں میں حکومت کی طرف سے کنٹرول ریٹ(Control Rate) پر لوگوں کی سہولت کے لیے اناج غلہ دیا جاتا ہےاوراس سے صرف وہی لوگ فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جوراشن کارڈ(Ration Card) اپنے پاس رکھتے ہیں،کنٹرول ریٹ پر دیا جانے والا اناج وغلہ بازاری عام قیمت کے لحاظ سے بہت ارزاں وسستا ہوتا ہے،اس صورتِ حال میں سوال پیدا ہونا طبعی بات ہے کہ صدقۂ فطر میں گیہوں کی کونسی قیمت کا اعتبار کیا جائے؟ بازاری عام قیمت کا یا کنٹرول ریٹ کا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ عام بازاری قیمت کا اعتبار ہوگا،کنٹرول ریٹ (راشن) کا کوئی اعتبار نہیں؛ کیوں کہ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ نصف صاع (یعنی پونے دوکلو) گیہوں مسکین کو پہنچ جائے یا اگر قیمت دی جائے،تو اس قیمت سے وہ بازار سے اگر چاہے،تو اتنی گیہوں خرید سکے اور یہ ظاہر ہے کہ راشن کارڈ، ہر کسی کے پاس ہونا تو ضروری نہیں؛ لہٰذا بازار سے خریدنے کے لیے عام بازاری قیمت دینا چاہیے۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

> ”قیمت ادا کرنی ہو،تو بازاری دام سے ادا کرنی ہوگی،کنٹرول (راشن) کی قیمت معتبر نہیں،فقیر کے ہاتھ میں اتنی رقم پہنچنی چاہیے کہ اگر وہ اس کے گیہوں خریدنا چاہے،تو پونے دوکلو گیہوں بازار میں مل جائیں،کنٹرول (راشن) کے حساب سے قیمت دی جائے گی،تو بازار سے اتنی گیہوں نہیں ملیں گے۔“(۱)

---

(۱) فتاویٰ رحیمیہ:۵/۱۷۳-۱۷۴

غرض یہ کہ کنٹرول ریٹ کا اعتبار نہ ہوگا؛ بلکہ عام بازاری قیمت دینا چاہیے، ہاں کوئی گیہوں ہی دینا چاہے تو اختیار ہے کہ وہ خواہ بازار سے خرید کردے یا راشن کارڈ کے ذریعہ خرید کردے، اس میں کوئی حرج نہیں؛ کیونکہ فقیر کے ہاتھ خود گیہوں پہنچ گئی ہے۔

جہاں اشیائے منصوصہ نہ ملتی ہوں، وہاں صدقۂ فطر کس طرح ادا کریں؟

صدقۂ فطر کا پانچ چیزوں سے دینا شریعت میں منصوص ہے؛ یعنی شعیر (جو) تمر (کھجور) حنطہ (گیہوں) اقط (پنیر) اور زبیب (کشمش) رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے زمانے میں اور حضراتِ صحابۂ کرام کے زمانے میں انہی پانچ چیزوں سے صدقۂ فطر دیا جاتا تھا، جیسا کہ روایات میں آیا ہے۔ (۱)

احادیث کی روشنی میں علمائے حنفیہ نے لکھا ہے کہ گیہوں دینا ہو، تو نصف صاع اور دوسری چیزیں دینا ہو، تو ایک صاع دینا چاہیے (اور صاع کی مقدار پہلے گذر چکی ہے اور اگر قیمت دینا ہو، تو بھی اسی لحاظ سے قیمت دینا چاہیے کہ گیہوں میں نصف صاع کی اور دیگر اشیا میں ایک صاع کی قیمت۔ (۲)

---

(۱) البخاري:۲۹۳-۲۹۴،الرقم:۱۵۰۵-۱۵۱۲، المسلم :۹/۳۷۹-۳۸۱،الرقم:۹۸۴-۹۸۵،الترمذي:۲/۵۱ ۵۵،الرقم،-۶۷۳-۶۷۶ ، أبوداود :۲/۳۴۶ - ۳۵۲،الرقم، ۱۶۰۷- ۱۶۱۹،السنن الکبریٰ للنسائي:۳/ ۳۶-۴۳، الرقم:۲۲۹۱ -۲۳۰۹،سنن ابن ماجه:۳/۲۸۳-۲۸۷،الرقم،۱۸۲۵-۱۸۳۰، السنن الکبریٰ للبیهقي :۴/۲۶۹-۲۸۵، ۷۶۷۰-۷۷۱۵

(۲) قال: [یجب نصف صاع من بر أو دقیقه أو سویقه أو زبیب أو صاع تمر أو شعیر]ولو ردیئاً وما لم ینص علیه کذرة وخبز یعتبر فیه القیمة .
(الدرالمختارمع الشامي:۳/۳۱۸-۳۱۹، البحرالرائق :۲/۴۴۱-۴۴۳، الهدایة: ۲/۲۳۵،نورالإیضاح :۲۶۳)

مگر یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض علاقے ایسے ہیں، جہاں یہ منصوص اشیا پیدا ہی نہیں ہوتیں اور وہاں کے لوگوں میں ان چیزوں کے استعمال کا رواج بھی نہیں ہے؛ بل کہ وہاں دوسری چیزیں کھائی جاتی ہیں، یہ لوگ اگر اپنی جگہ کی رائج غذاؤں میں سے کوئی چیز صدقۂ فطر میں دے دیں، تو جائز ہوگا ؟ اگر نہیں تو منصوص اشیا کی قیمت کس اعتبار سے ادا کریں؛ جب کہ وہاں یہ چیزیں پیدا ہی نہیں ہوتیں اور نہ ملتی ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں کے لوگوں کا اپنی رائج غذاؤں میں سے کسی چیز کا صدقۂ فطر میں دے دینا کافی نہیں ہے؛ بل کہ منصوص اشیا میں سے کسی ایک کی قیمت دینا چاہیے۔

''الدر المختار''میں ہے:

''ومالم ينص عليه يعتبر فيه القيمة ''.

ترجمہ: یعنی جو چیزیں منصوص نہیں، ان میں قیمت کا اعتبار ہوگا۔(۱)

اب رہا یہ سوال کہ قیمت کس اعتبار سے دی جائے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان علاقوں سے قریب جو علاقے ایسے ہیں، جہاں یہ منصوص اشیا ملتی ہیں، وہاں کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔ فتاوی محمودیہ میں حضرت اقدس مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ نے بھی اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں یہی تحریر فرمایا ہے۔(۲)

---

(۱) الدر المختار مع الشامی:۳/۳۱۹

(۲) چناں چہ اسی مسئلے کے متعلق تفصیلاً گفتگو کرنے کے بعد حضرت مفتی محمود صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ

''مقاماتِ خط کشیدہ میں سے، جو مقام آپ کے زیادہ قریب ہو اور وہاں اشیائے منصوصہ ملتی ہوں ،وہیں کے نرخ کا اعتبار کرلیا جاوے''۔ (فتاوی محمودیہ: ۷/۲۷۴)

حضرت اقدس کی جملہ کتابیں مفت ڈاؤن لوڈ کرنے اور دیگر مزید گراں قدر
معلومات کے اضافہ کیلئے ہماری ویب سائٹ پر وزٹ کیجئے۔

www.muftishuaibullah.com

MAKTABA MASEEHUL UMMAT DEOBAND
Minara Market, Near Masjid-e-Rasheed, DEOBAND - 247554
Mobile: + 91-9634830797 / + 91- 8193959470
MAKTABA MASEEHUL UMMAT BANGALORE
84, Armstrong Road, Bangalore - 560 001 Mobile : +91-9036701512
E-Mail:maktabahmaseehulummat@gmail.com